بٹوارہ
آنند لہر

عزت مآب سلیم سالک

کی نذر

کلوہن واحد ام کے شاعر

منشی رشید

محروں

بٹوارہ

(افسانوی مجموعہ)

مُصنّف: آنند لہر

بٹوارہ

(افسانوی مجموعہ)

مُصنّف: آنند لہر

اُردو بک سوسائٹی، دہلی

ISBN. 81-89575-10-4.

کتاب	:	بٹوارہ (افسانوی مجموعہ)
مُصنِف	:	آنندلہر پلاٹ نمبر-۱۹، بخشی نگر، جموں توی-۱۸۰۰۰۱
اشاعت	:	۲۰۰۹ء
تعداد	:	۱۰۰۰
قیمت	:	۲۵۰/روپے
کمپوزنگ	:	کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں-۱
طباعت	:	انیس آفسیٹ پرنٹرز، دہلی-۲
ناشر		اُردو بُک سوسائٹی ۹۲۲- کوچہ روہیلا خاں، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

" BATWARA "
(SHORTSTORIES)

WRITER : ANAND LEHAR

2009
PRICE : RS.250/-
PUBLISHER

URDU BOOK SOCIETY
922- KUCHA ROHELLA KHAN,
DARYA GANJ, NEW DELHI-110002.

اِنتساب

جموں بار ایسوسی ایشن کے

اُن نوآموز وکیلوں کے نام

جو صرف میری عزت ہی نہیں کرتے

بلکہ مُجھ سے ازحد محبت بھی کرتے ہیں -

آنند لہر

فہرست

نمبر شمار	عنوان		صفحہ نمبر
	دیباچہ	اشرف حسین	۹

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

دیباچہ

آنند لہر کا تعلق سرزمینِ جموں سے ہے، جو تخلیقی اعتبار سے ہمیشہ ہی زرخیز رہا ہے۔ وہ ادب سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ جب بھی ذہن کی بے قرار موجیں اِظہارِ خیال کے لیے اُکساتی ہیں وہ جذبات واحساسات کو قلم بند کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ اُن کا اِظہارِ خیال ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کی شکل اِختیار کرتا ہے۔ سپریم کورٹ کے ایک نامور ایڈوکیٹ ہونے کے ناتے آپ کی مصروفیات کا جو عالم ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اِس کے باوجود ادبی دِلچسپیوں کے لیے کس طرح وقت نکال پاتے ہیں، یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ادبی ذوق وشوق نے اِس دورِ جدید میں وہ مقام اُنھیں عطا کیا ہے جس کو بیان کرنا مشکل ہے۔ اُن کے ڈراما ''بٹوارہ'' پر صدر جمہوریہ ہند نے ۵۰،۰۰۰ روپے کی ایک چھوٹی سی رقم سے اُنھیں سرفراز کیا۔ اُنھوں نے ''اگلی عید سے پہلے''، ''سرحدوں کے بیچ''، ''مجھ سے کہا ہوتا'' اور ''یہی سچ ہے'' جیسے عمدہ اور بے مثال ناول لکھے۔ ساتھ ہی ساتھ ''انحراف''، ''سرحد کے اُس پار'' اور ''کورٹ مارشل'' جیسے افسانوی مجموعے مختلف موضوعات پر لکھ کر اپنی بے پناہ فکری وفنی صلاحیتوں کا اعتراف کرایا ہے۔

آنند لہر کے زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' میں زِندگی کے حقائق کو فلسفیانہ

انداز میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اِس امر سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ عصر حاضر میں ایسا کوئی شعبۂ حیات نہیں ہے جہاں بے ایمانی، رشوت خوری، اِستحصال نہیں۔ کچھ ایسی ہی فکر کو پیش کرتا ہے اُن کا افسانہ ''جج صاحب''۔

''جج صاحب اور اندر چلے گئے۔ نیرج جھک کر کھڑا ہو گیا مگر جج صاحب نے اُسے صرف اِتنا کہا.........

''میری بیٹی کا خیال رکھنا۔''

اِس افسانے میں شروع ہی سے جج صاحب کو ایک اِیماندار، باوقار شخص کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ سبھی اُن کی اِیمانداری کے قائل ہیں مگر اِس آخری جملے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ کہیں اُن کے اندر بھی بے اِیمانی چھپی ہوئی ہے۔

افسانہ ''بٹوارہ'' میں افسانہ نگار نے خوبصورت لفظوں، صنعتوں، تشبیہوں اور اِستعاروں کو اِستعمال کیا ہے۔ اِس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ لفظوں کے ذریعے نفرت، وہ بھی ایسے انداز میں جس کے بارے میں عام قاری سمجھ نہیں سکتا ہے کہ وہ لفظوں کے ذریعہ محبت کی بات کر رہا ہے یا نفرت پھیلانے کی۔ یہ بٹوارہ زمین کا ہو سکتا ہے، اِنسانوں کو الگ کر سکتا ہے مگر دِلوں کو نہیں۔ لڑائی اِنسانوں کی ہوگی چرندوں پرندوں کی نہیں۔

''ہم ایک جیسا دُودھ دیتی ہیں۔ ہمارا پھل ایک جیسا ہے۔ چڑیاں درختوں پر چہچہا کر کہہ رہی تھیں۔ یہ بٹوارہ تم نے کیا ہے، زمین کا، مگر سبز درختوں، جانوروں اور پرندوں کو بھی مل رہی ہے۔''

افسانہ ''دُوسرا بٹوارہ'' میں افسانہ نگار نے ایک گھر کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ وہ گھر جہاں ہر جانب خوشیاں تھیں۔ ایکتا اور محبت سب میں بھری پڑی تھی مگر ایک نئی دُلہن نے گھر کی خوشیاں ختم کر دیں۔ محبت کے بجائے نفرت کی دیوار کھڑی کی اور

بٹوارہ کرادیا۔ افسانے کے آخر میں دُلہن کے گھر والوں نے دُلہن کے اُس خوبصورت گھر کی مثال، محبت اور ایکتا کی طرف اشارہ کیا ہے جو اُس کا سسرال ہے۔

''لوگ زِندگی میں ایک بار تیرتھ کرتے ہیں مگر میری
بیٹی تو تمام زندگی تیرتھ ستھان میں رہے گی......اُس
گھر کا ماحول سب سے جدا ہے۔ خوشیاں و محبت کے
نغمے پھوٹتے ہیں۔ وہ تو سچ مچ تیرتھ ستھان ہے۔''

افسانہ ''بیراگن'' میں ایک عورت کی محبت کو دِکھایا گیا ہے جو آخر تک اِسی جدو جہد میں رہتی ہے کہ اُس کا شوہر بیراگ بھول جائے مگر اِختتام پر اُس کا شوہر بیراگ کو بھول جاتا ہے اور ساتھ ہی اپنی بیوی کو بھی......اب اُس کے لیے صرف ایک راستہ بچا۔ بیراگ کا۔ اِس افسانے میں عورت کی محبت، جفاکشی اور جانفشانی کو دِکھانے کی کوشش کی ہے۔

افسانہ ''دُوسری بے انصافی'' میں سماج کا ایک سچ دِکھانے کی کوشش کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عدالت صرف اپنا فیصلہ سناتی ہے۔ اِس کا کیا اثر ہوتا ہے کوئی نہیں دیکھتا۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ مرنے والوں کے رِشتہ داروں کا کیا ہوا۔ اُن کے بچوں کا کیا حال ہوا۔ اُن کی بیویوں کا کیا ہوا۔ اِس بات پر کوئی بحث نہ تھی۔

افسانہ ''ایک اور ہجرت'' کے ذریعے مسئلہ کشمیر کو پیش کیا ہے اور اِنسانی زِندگی کی کشمکش کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

افسانہ ''دادی اماں'' میں افسانہ نگار نے دادی کی محبت و شفقت کو دِکھایا ہے کہ وہ کس طرح اپنے دونوں پوتوں کی پرورش کرتی ہے۔ وہ صرف اور صرف اپنے پوتوں کے بارے میں سوچتی ہے۔ ہر عمل پوتوں کے لیے کرتی ہے۔ اپنی زِندگی کو ختم کرنے سے پہلے وہ رقم کرتی ہے........

''پیارے بچو! کپڑے کچھ دِنوں کے لیے دھو چکی

ہوں۔ سویٹر دُوسرے بڑے ٹرنک میں ہیں۔ راجہ
تمہیں کہہ دُوں کہ بدیش جا کر اپنی صحت کا خیال رکھنا
اور کھانا بنا پڑا ہے۔ جب مجھے جلا کر آنا تو فوراً کھا
لینا، بھوکے نہ رہنا۔''

یہ اُس کی ممتا ہے جو اپنے پوتوں پر قربان کر رہی ہے اور دُوسری طرف اُن پوتوں کی نفسیات کو بھی دِکھایا ہے جو ایک بڑی رقم کے لیے اپنی دادی کو مارنے کی سوچ رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ لمحات و خیالات بھی آ رہے ہیں جو دادی کے ساتھ گزرے تھے۔

افسانہ ''یہ سرحدیں'' میں افسانہ نگار نے عورت کا موضوع اُٹھایا ہے اور کہتے ہیں کہ سبھی مذہبوں کی تعلیم یہی ہے کہ عورت عظیم ہے۔ اُس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے اور اسی فرض کو آگے بڑھانا ہے۔ اِسی لیے جب اُس نے عورت کی عزت بچانے کے لیے سرحد پار کی اور پکڑا گیا تو برجستہ کہا.........

''حضور عورت کی عزت بچانا بھگوان کا حکم ہے اور
سرحد کی حفاظت کرنا اِنسان کا حکم ....''

یعنی کہ سرحد کی حفاظت سے پہلے عورت کی حفاظت ضروری ہے۔ اِس کی حفاظت کے لیے سرحدیں بھی پار کی جاسکتی ہیں۔ اِس افسانے کے ذریعہ ایک عظیم فکر کو بلندی دینے کی سعی کی ہے۔

''جنگ اِنسانوں کے خلاف نہیں، سرحدوں کے خلاف
ہونی چاہیے اور لڑائی مُلکوں کو بچانے کے لیے نہیں
بلکہ عورت کی عزت بچانے کے لیے ہونی چاہیے۔''

اس کے علاوہ اور بھی افسانے رقم کیے گئے ہیں جن میں مختلف مسائل اور جذبات و احساسات کو پیش کیا گیا ہے۔ اِن افسانوں کے مطالعے سے آنند لہر کی فکر کا

علم ہوتا ہے کہ اُن کے اندر کتنا احساس شدت سے موجود ہے، جو دِل کی گہرائیوں سے نکل کر صفحہ کو رنگین بنا رہا ہے۔ زِندگی کے یہ نشیب وفراز، بدلتے وقت اور حالات، جذباتی بے کیفی، بے رحم ماحول کی سنگینی اور خودغرضی کے تلاطم میں آنندلہر کا یہ افسانوی مجموعہ عہدِ جدید کے فلسفۂ حیات کو مؤثر کیفیات سے ہم کنار کرنے میں کامیاب ہے۔

افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' دراصل زِندگی کی تلخ سچائیوں کی بھرپور ترجمانی کرتا نظر آتا ہے اور اِس عمل میں بے حد کامیاب ہے۔ اللہ تعالیٰ آنندلہر کو اپنے فن کی طرف مزید توجہ دینے کی فرصت عطا کرے اور قلم میں وہ طاقت دے تا کہ صفحہ رنگینی کا کام چلتا رہے۔ آمین......!

اشرف حسین

۱۷/اکتوبر ۲۰۰۹ء

بٹوارہ

بات کوئی زیادہ بڑی نہیں تھی مگر بڑی ہوگئی۔ ایک لڑکے کا گیند مٹکی سے ٹکرا گیا۔ مٹکی نہ ٹوٹی اور نہ ہی گیند کو کوئی نقصان ہوا مگر نفرت کی ہوا کو تیز چلنے کا موقعہ مل گیا۔ پنچائت ہوئی۔ سرپنچ اور پنچ آپس میں بٹ گئے۔ سرپنچ اُس گاؤں کا نہیں تھا اور پنچوں کی تعداد دو دو ہوگئی۔ سرپنچ نے مسئلہ سُلجھانے کی کوشش کی اور زور سے کہنے لگا کہ یہ شریف لوگ ہیں کوئی اور ہوتا تو گیند پھاڑ دیتا یا مٹکی توڑ دیتا۔ یہ سُن کر لوگوں نے ایک دُوسرے پہ حملہ کیا اور گیند پھاڑ دیا اور مٹکی بھی توڑ دی۔ سرپنچ نے منع کیا اور امن کے حق میں ایک تقریر بھی کی اور یہ کہا کہ ''بھگوان کے لئے اب ایک دُوسرے کے گھر نہ جلانا۔'' یہ سُن کر لوگوں نے پھر حملہ کیا اور ایک دُوسرے کے گھر بھی جلا دئے۔ اِس پر سرپنچ نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا ''اب جلے ہوئے گھروں کو دوبارہ تعمیر کرنے سے روکنا نہیں۔'' پھر لوگوں نے ایک دوسرے کو روکا۔ اصل میں سرپنچ اُس گاؤں کا نہیں تھا اِس لئے شائد لوگوں کو زیادہ ہمدردی دِکھانی پڑتی تھی۔ زیادہ آنسو بہانے پڑتے تھے۔ اُس نے لوگوں کو بُلایا اور لوگوں کو سمجھانے لگا۔ اِتفاق کے حق میں اُس نے ایک بہت بڑی تقریر بھی کی اور لوگوں کو کہا کہ ''ایسا کام مت کرو کہ گاؤں دو حصوں میں

بٹ جائے۔''

''کیا یہ گاؤں بٹ بھی سکتا ہے؟'' ایک شخص نے پوچھا۔

''مگر خدا کے لئے اِکٹھے رہنا سیکھو..... اِتفاق میں بڑی طاقت ہے۔'' سرپنچ نے کہا۔

بات آگے بڑھی اور ایک روز بٹوارہ ہوا۔ دو گاؤں بن گئے۔ لوگ تقسیم ہوئے اور سرپنچ نے اعلان کیا کہ اب وہ دُکھی ہوگیا ہے۔ اُس کا دل بڑا اُداس ہے۔ اِس لئے اب وہ یہ دونوں گاؤں کو چھوڑ کو تیسری جگہ پر جا رہا ہے۔ اب ایک گاؤں کے دو گاؤں بن گئے۔ فقیر چند پنساری ایک گاؤں میں آ گیا اور راج دین نمبردار دُوسرے گاؤں میں۔ لوگوں کے گھر اُجڑ گئے۔ اُداس اُداس سڑکیں تھیں۔ لوگ پریشان تھے کہ اُن کا ایک دُوسرے کے گھروں میں آنا جانا بھی بند ہوگیا۔ پھر فقیر چند کی دوائی کے بغیر لوگ مرنے لگے۔ وقت اور آگے بڑھا۔

آخر ایک دن نورا کی بھینس کمزور ہوگئی۔ یہ بھینس تیس کلو دُودھ دیتی تھی۔ بھینسا غلطی سے سرحد کے پار چلا گیا ہے۔ بھینسا اور بھینس ایک دُوسرے کے سامنے کھڑے رہتے مگر مل نہیں سکتے تھے۔ ایک دِن پھر بھینس نے دُودھ دینا چھوڑ دیا۔ اُسے دیکھ کر باقی بھینسوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

اِدھر کے ایک شخص نے سپاہی سے کہا۔ ''صاحب میرا بھینسا وہ سامنے کھڑا ہے۔'' اُس پر سپاہی نے کہا کہ'' پاس پورٹ بناؤ اور دُوسرے راستے سے آؤ۔''

نیہا بڑی خوبصورت تھی۔ اُس کا باپ خوبصورت چوڑیاں بناتا تھا اور دِن رات چوڑیاں بنانے میں لگا رہتا مگر گھر میں غربت تھی کہ جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ نیہا اور بڑی ہوئی۔ ایک دِن اُس نے پوچھا۔ ''کیا میری ماں بھی میری طرح غریب تھی......؟''

''نہیں بیٹی' ایسی بات نہیں ہے' کیونکہ اُس وقت چوڑیوں کے بہت گاہک

تھے۔ رنگ برنگی اور خوبصورت چوڑیوں کے۔"

"وہ گاہک کہاں گئے......؟ نیہا نے پوچھا۔

"وہ لوگ پار والے ہیں اور وہاں اُن کی باہیں کلائیاں خالی ہیں اور گاؤں کی مانتا کے مطابق اگر اُن کی باہوں پر چوڑیاں نہ ہوں تو بارش یا تو بہت برستی ہے اور یا تو برستی ہی نہیں۔" یہ سُن کر نیہا حیرانی سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

یہی حال اب اُس گاؤں والوں کا ہے۔ ایک دِن شادی تھی۔ اِشاروں اِشاروں میں لوگوں نے فیصلہ کرلیا۔ ڈھول ایک طرف بجا تو تمور دُوسری طرف' کیونکہ تقسیم میں صرف لوگ ہی نہیں بلکہ کھیل' آنگن' رسمیں' بینڈ' سکول' کتابیں سب بٹے تھے۔ مگر آگے چل کر ڈھول اور تمور کی تال الگ الگ ہو گئے۔ گھوڑی گھبرا گئی اور بھاگ گئی۔ دُولہا زخمی ہوا۔ سائیں پھکڑ زور سے ہنسنے لگا۔ "کیسے لگا۔ میں نے کہا نہ تھا کہ تقسیم مت کرو اور پھر اصل بات تو یہ ہے کہ تم نے تقسیم نہیں کی ہے بلکہ تفریق کی ہے۔"

راج دین کا بیٹا گلاب سخت بیمار ہو گیا۔ اُس نے زور سے کہا۔ "فقیر چند سے کہو کہ بیٹے کو دست لگے ہیں۔" دُوسرے دِن فقیر چند نے دوائی بنائی اور اعلان کیا کہ دوائی تیار ہے مگر جائے گی کیسے۔ گھر اُن کے چند گز کے فاصلے پر تھے مگر وہاں جانے کے لئے اجازت نامہ لینا پڑتا تھا اور اِس میں بڑی پیچیدگیاں تھیں اور مشکلات بھی۔

راج دین تنگ آکر ایک فوجی کے پاس گیا۔

"صاحب میرا بچہ بیمار ہے۔"

"تو کیا کریں......؟"

"صاحب سرحد سے دوائی منگوانی ہے۔ اگر اِنسانیت کے ناطے ہو سکے۔"

اس طرف کے سپاہی نے دُوسری طرف کے سپاہی کے ساتھ بات کی۔ فقیر چند کی دوائی سپاہی نے اُس طرف کے سپاہی کو دی مگر سائیں پھکڑ زور سے ہنسا۔

"کیوں ہنستے ہو....؟" سائیں پھکڑ سے ساتھ والے شخص نے پوچھا۔

''یہ راج دین اُس وقت بٹوارے کے حق میں بڑے نعرے لگا رہا تھا۔ کیا اُس وقت اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کے بیٹے نے بیمار ہونا ہے اور فقیر چند کی دوائی ضروری ہے۔''

''اُس وقت کافی باتوں کا ہمیں علم نہیں ہوا۔ میرے کھیت سوکھے ہیں اور ساتھ میں دریا کا پانی بہتا ہے۔'' راج دین نے کہا۔

''سرحد کے اُس پار سیلاب آتا ہے اور فصل تباہ ہوتی ہے اور سرحد کے اِس پار سوکھا ہے اور فصل تباہ ہوتی ہے۔ اور بھوک دونوں طرف کے لوگوں کو برابر لگتی ہے۔'' ناتھی نمبردار نے راج دین کی بات کی تائید کی۔

لوگ چھپ چھپا کر اِدھر اُدھر جاتے رہے۔ سرپنچ اپنی زِندگی میں کئے گئے اہم کاموں پر کتاب لکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک دِن اُن دونوں گاؤں میں آیا۔ لوگوں نے سواگت کیا اور گاؤں بانٹنے کا شکریہ ادا کیا۔ پھر سرپنچ نے تقریر کی اور کہا کہ ''اب اِتفاق سے رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم اُن کے چشمے پر اپنا حق جتلاؤ' وہ تمہارے کھیل کے میدان پر۔'' اُس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایسا ہی ہوا تو لڑنا مت۔'' اِس کے بعد پھر سرحدیں تیز ہوئیں۔ چشمے کو حاصل کرنے کے لئے اُگرواد شروع ہوا اور سرحد مضبوط ہوگئی۔ اِتنی مضبوط ہوئی کہ لوگوں کا اِدھر اُدھر جانا بالکل بند ہوگیا۔ یہاں تک کہ اُن کے ایک دُوسرے کو دیکھنے پر بھی پہرے لگ گئے۔ اِن سب باتوں سے سائیں پھکڑ کافی پریشان ہوا۔ سائیں پھکڑ کبھی کبھی شنکھ بجاتا ہے اور کبھی کبھی نماز پڑھتا ہے۔ اُس نے اعلانیہ کہا کہ ہزاروں برس پہلے ہم نے شنکھ بجائے تھے تب جا کر نماز نصیب ہوئی تھی۔ ایک دِن دونوں طرف کے کمانڈروں نے میٹنگ کی اور فیصلہ کیا کہ دونوں طرف مائنیں لگائی جائیں۔ پھر مائنیں لگائی گئیں۔

ایک دِن گاؤں کے دُودھ دینے والے مویشیوں کا ایک جھنڈ اُدھر گیا۔ تب مائنیں پھٹیں۔ اب دونوں طرف کے گاؤں میں دُودھ کی کمی ہوگئی۔ اور بھینسیں یوں

چیخیں گویا کہہ رہی ہوں کہ اگر انسان نے زمین کی تقسیم بند نہ کی تو وہ دُودھ نہ دیں گی۔

گلاب نے زور سے کہا۔ ''میری غربت بڑھ گئی ہے۔ میتھی بکتی ہے مگر اِس سے کم فائدہ ہوتا ہے۔''

''وہ کیسے.....؟'' احمد نے پوچھا۔

''مجھے یہاں سے سمندر پار جا کر اپنا سامان بیچنا پڑتا ہے اور اِتنا خرچ ہو جاتا ہے کہ آمدنی بہت کم رہ جاتی ہے اور پھر میری میتھی کے گاہک پار رہتے ہیں اور اُس کے کرائے کی وجہ سے قیمت اِتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ پار والے لوگوں کی قوتِ خرید سے باہر ہے۔'' سرحد کے اُس طرف کے شخص نے کہا ''قصور کی میتھی ملتی ہی کہاں ہے۔ ہزاروں میل سفر طے کر کے یہاں آتی ہے۔ کرایہ اِتنا زیادہ ہے کہ خریدنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔''

نوردین کی بیٹی بیگماں جوان تھی۔ شادی کی تاریخ مقرر تھی مگر معلوم ہوا کہ میتھی لے جانے والا جہاز ڈوب گیا۔

سائیں داس جو سرحد کے اُدھر رہتا تھا' کو معلوم ہوا کہ نوردین کو روپوں کی ضرورت ہے۔ سائیں داس کافی امیر ہو گیا تھا۔ سائیں داس اور نوردین پکے دوست تھے۔ اُن دنوں سائیں داس غریب ہوا کرتا تھا اور نوردین اُس کی مدد کرتا تھا۔ سائیں داس نے زور سے کہا ''نوردین شادی نہ توڑنا۔ روپے بھیج رہا ہوں......'' سائیں پھکڑ پھر زور سے چیخا۔ ''روپے مت بھیجنا کیونکہ اُس گاؤں کے روپے اِس گاؤں میں نہیں لگتے۔''

''پھر کیا کیا جائے.....؟'' سائیں داس کے ساتھ کچھ اور لوگ ملے۔ سب نے ایک سُرنگ بنائی اور سائیں داس نے دُودھ بھیجا۔ ایک دن وہ دُودھ پکڑا گیا۔ فوجی اکھٹے ہوئے۔ سائیں داس بچ گیا۔ ''صاحب یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ کس گاؤں کا دُودھ ہے کیونکہ دُودھ کا رنگ تو ہر طرف ایک جیسا ہوتا ہے۔ یہ انسان کے

بنائے ہوئے روپے تو ہیں نہیں کہ ایک ملک کے رُوپے دُوسری طرف نہیں لگ سکیں۔ یہ جانوروں کا دیا ہوا دُودھ ہے جس کا رنگ ہر ملک میں ایک جیسا ہے اور ہر ملک کا آدمی اِسے پی سکتا ہے۔'' اِس پر دونوں طرف کے سپاہی پریشان ہوئے مگر اُنہیں کر کچھ نہ سکے۔ مگر اِس سے سرحدیں اور مضبوط ہو گئیں۔

نور دین کا بیٹا جوان ہوا۔ اب اُس کی شادی تھی۔ گاؤں کی چوپال پر اب باتیں کرنے لگے تھے۔ پہلے شادیوں میں مل کر لوگ ناچتے تھے اور وہ دیکھو سامنے غریب داس کا گھر ہوا کرتا تھا۔ وہ ہر شادی میں ناچا کرتا تھا۔ میری شادی میں بھی ناچا تھا اور اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے بیٹے کی شادی پر بھی ناچے گا۔

''مگر ہم غریب داس کو بلاتے کیوں نہیں......؟''

''بیٹا سرحد ہے لہٰذا غریب داس اِدھر نہیں آسکتا ہے۔''

مگر غریب داس سرحد کے سامنے کھڑا ہو کر ہر روز نور دین کے گھر کو دیکھتا۔ وہ اُدھر ہی ناچتا۔ دونوں طرف کے فوجی اُسے پاگل سمجھتے۔ اب نور دین کے لڑکے کی شادی میں ایک مشکل اور آرہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ رواج کے مطابق کچھ چاول دُوسرے گاؤں سے آنے تھے، اگر ایسا نہ ہوتا تو پیر خوش نہ ہوتا۔ نور دین کی پریشانی بڑھنے لگی۔ وہ اِس بات پر پریشان تھا کہ اب وہ کرے تو کیا کرے۔ اِدھر غریب داس اُسے دیکھتا تھا۔ نور دین کا ایسا ماننا ہے کہ اگر گاؤں چنڈک کے چاول نہ آئے تو شائد یہ شادی کامیاب نہ ہو۔ غریب داس نے ایک دِن چاول لئے اور سُرنگ کے ذریعہ پار پہنچا دیئے۔ فوجیوں نے پکڑ لئے مگر کچھ نہ کر سکتے تھے کیونکہ چاولوں کا بھی کوئی ملک نہیں ہے مگر ٹینکوں، جہازوں اور توپوں کی شکست دیکھ کر دونوں طرف کے فوجیوں نے سائیں پھکڑ کو بلایا اور پوچھا کہ چاول پار کیسے کئے گئے۔ یہ دُودھ پار سے یہاں کیسے آیا؟ سائیں پھکڑ نے اُنہیں سُرنگ دِکھائی۔

فوجیوں نے دونوں طرف کے لوگوں کو بلایا اور کہا کہ یہ سُرنگ کیسے بنی۔

سب نے اِنکار کیا۔ اِس پر سائیں پھکڑ زور سے کہنے لگا۔

''صاحب یہ بے گناہ ہیں۔ اِنہوں نے سُرنگ نہیں نکالی ہے۔''

''مگر یہ نکلی کیسے.......؟''

''صاحب زمین کی بھی اپنی رفتار ہے۔ یہ بھی چلتی ہے اور اِنسان چونکہ اس کے بیٹے ہیں اِس لئے اِن کو ملاتی رہتی ہے۔ کبھی دریاؤں کا راستہ بدل کر، کبھی بھونچالوں سے سرنگیں نکال کر، کبھی اپنی مٹی کو کھسکا کر۔''

فوجی حیران ہو گئے اور کہنے لگے ''ہم سرحدوں کی حفاظت کر سکتے ہیں، زمین کی نہیں۔ اِس لئے زمین جو کرتی ہے کرنے دو۔''

فوجیوں کو اِس طرح کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ دونوں ملکوں کی بھینسیں اِکٹھی ہو گئیں۔ گویا کہہ رہی ہوں کہ ''لڑائی تمہاری ہوگی، ہماری نہیں ہے۔ ہم ایک جیسا دُودھ دیتی ہیں۔ درخت گویا کہہ رہے ہوں ہمارا پھل ایک جیسا ہے۔ کُتے بھونک کر گویا کہہ رہے ہوں ہماری آواز ایک جیسی ہے۔ سب لوگ بے بس تھے اور فوجی پریشان۔ چڑیاں درختوں پر چہچہا کر کہہ رہی تھیں یہ بٹوارہ تم نے کیا ہے زمین کا، مگر سزا درختوں، جانوروں اور پرندوں کو بھی مل رہی ہے۔

***

دادی اماں

راجہ اور گوپی ایک عجیب اُلجھن میں تھے۔ اُنہیں لگ رہا تھا کہ زِندگی کا سفر دھاگے کی طرح ہے، جس میں قدم قدم پر گانٹھیں لگی ہیں۔ پہلی گانٹھ اُس وقت لگی جب اُن کی ماں مری۔ اُن کے باپ نے دُوسری شادی کی تو یہ دُوسری گانٹھ تھی اور جب وہ چلا گیا تو تیسری گانٹھ لگی۔ یہ گانٹھ بھی کیا چیز ہوتی ہے کہ چیز کا وجود تو پورا رہتا ہے مگر اُس کی لمبائی کم ہو جاتی ہے۔ گویا کہ عمر کے دھاگے پر لگے تو یوں لگتا ہے کہ زِندگی تو پوری ہے مگر جینے کے دِن کم ہو جاتے ہیں۔ مگر اب کی بار جو گانٹھ لگی تھی اُس سے تو پورے دھاگے کے وجود کو ہی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ راجہ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دیش سے باہر جانا تھا، مگر روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے دونوں بھائی کافی پریشان تھے۔ اُن کے پاس دادا کی لکھی ہوئی وصیت تھی جس کے مطابق وہ لاکھوں روپوں کی جائیداد کے مالک ضرور تھے، مگر یہ سب اُنہیں دادی کی موت کے بعد ملنا تھا۔ اُن کے دادا گلاب نے بڑی زوردار آواز میں لکھا تھا۔

''میں جب تک زندہ ہوں خود مالک رہوں گا۔ میرے مرنے کے بعد میری

زوجہ اور اُس کے بعد میرے پوتے راجہ اور گوپی برابر کے مالک ہوں گے۔''

اُن دونوں کو دادی نے بڑی چاہ کے ساتھ پالا تھا کیونکہ اُن کا والد جب دُوسری بیوی کے ساتھ چلا گیا تو ایک وہی اُن کا سہارا تھی۔ وہ اُن کے کپڑے دھوتی، نہلاتی، کھانا پکاتی اور اسکول بھیجتی۔ دادی اُنہیں دُنیا کی سب سے مضبوط ترین چیز لگتی اور حقیقت میں وہ مضبوط ثابت ہوئی تھی۔ رات کو اُنہیں بستر پر سُلا دینا اور خود فرش پر سونا، اُنہیں گرم کپڑے پہنانا اور خود سردی میں ٹھٹھرنا، اُنہیں تازہ کھانا دینا اور خود بچا کھچا کھانا، یہ سب اُس عورت کی مضبوطی کی علامتیں تھیں۔

اُن کی جماعت کا اُستاد بھی اُس عورت سے ڈرتا تھا۔ کہیں اگر دادی کو معلوم ہو جائے کہ اُس کے پوتے کو کسی نے مارا ہے تو وہ اسکول جاتی اور ماسٹر کو ڈر سے اسکول سے ہی بھاگنا پڑتا۔ ایک بار ایک دوست نے راجہ کو کچھ بُرا بھلا کہا تو راجہ نے صرف اِتنا کہا۔ ''میں آج دادی سے شکایت کروں گا۔'' بس ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ سب نے مل کر راجہ کو ٹافیاں کھلائیں اور اُس سے وعدہ لیا کہ وہ اپنی دادی سے کچھ نہ کہے گا۔

اور سچائی یہ بھی تھی کہ اُسے کوئی کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ وہ اِتنے زور سے چیختی کہ اُس کی آواز سے کان پھٹنے لگتے۔ وہ دونوں پوتے اُسے حد سے زیادہ پیارے تھے۔ خود کب کھانا کھاتی کسی کو معلوم نہ تھا۔ کھاتی بھی ہے کہ نہیں محلے کے لوگ اِس بات پر بحث کرتے، مگر اُن دونوں کے لئے کھانا مزے دار ہو اور تازہ۔ رات کو باہر سوتی تاکہ کوئی اندر نہ جا سکے۔

ہر شادی بیاہ کا چرچہ یہی تھا۔ جب بھی جاتی سب سے پہلے پوتوں کے لئے کھانا ڈلواتی۔ پوریاں، آلو اور پھر مٹروں اور پنیر سے بھرے ہوئے برتن سے خوب طریقے سے پنیر چراتی، شور کرتی۔ کہتی ''میں نے لیا ہی کہاں ہے؟'' اُن دونوں کی زندگی بھی دادی ہی تھی۔ وہ اُس کے لئے جیتے اور اُس کے لئے مرتے۔ وہ ماں باپ کو دی جانے والی گالی برداشت کرتے مگر دادی کو کوئی اگر کچھ کہہ دیتا، آخری لڑائی لڑنے کو

تیار ہو جاتے۔

دادی کی دُعا رنگ لائی اور راجہ کو بدیش میں سیٹ مل گئی، مگر روپوں کا انتظام کہاں سے ہوگا۔ راجہ اور گوپی کو اِس کی فکر ستانے لگی۔

دادی نے کہا ''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے'' وہ اندر گئی اور ایک ٹرنک اُٹھا کر لائی اور روپوں کے سِکّے زمین پر گرا دئے اور بڑے فخر سے کہنے لگی ''اُٹھا لو جتنے اُٹھانے ہیں''۔ مگر اُس غریب کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس نے ایک ایک روپیہ بڑی مشکل سے اِکٹھا کیا تھا۔

اُس ایک ایک روپے کے اندر کئی کہانیاں بسی تھیں۔ کئی بار دیوالی کی مٹھائی کم لائی گئی تھی۔ کئی بار رات کو دِیا بجھا دیا گیا تھا تا کہ ایک روپیہ بچ جائے۔ ایک بار اُس نے کپڑے سلوائے تو درزی نے بٹن کم لگائے۔ وہ کم بٹنوں والے کپڑے کم مزدوری دے کر لائی اور ایک روپیہ بچاتے ہوئے کہنے لگی اِسی میں گزارا کرلیں گے۔ ایک بار اُس نے نائی سے جھگڑا کیا کہ اُٹھنّی کم دی تھی۔ کچھ روپے تو چائے میں دُودھ کم ڈال کر بچائے گئے تھے۔ یہ تمام باتیں ظاہر کرتی تھیں کہ ایک غریب کیسے روپے جمع کرتا ہے۔ اُس کے چہرے سے ایک اِطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔ لگتا کہ زِندگی کے ہر لمحے کو وہ بوڑھی عورت جیت رہی ہے۔ اُس نے یہ سارے سکے اِس طرح بھی جمع کئے کہ کئی بار صابن کم اِستعمال کیا اور کپڑے دھونے میں جسم زیادہ اِستعمال کیا۔ اُس نے کئی راتوں کو کم چپاتیاں کھائیں۔

مگر اُس غریب عورت کو یہ کہاں معلوم تھا کہ یہ روپے تو کچھ بھی نہ تھے۔ راجہ اور گوپی اِس بات پر ہنسے اور چپ ہوگئے۔ زمین کے کاغذ لے کر وہ تمام بینکوں میں گئے، سب آفیسروں کے پاس بھی گئے، مگر ہر ایک نے کہا کہ دادی کے مرنے کے بعد ہی وہ اِس زمین کے مالک بن سکتے ہیں۔ اُنہیں اپنے سپنے ٹوٹتے ہوئے نظر آئے اور دادی ایک فضول سی چیز۔ جب اُنہیں ہر طرف سے نااُمیدی ہوئی تو آپس میں مشورہ

کرنے لگے۔ ''بوڑھی اگر مر جائے تو اُس کا کیا بگڑ جائے گا؟'' راجہ نے کہا۔ ''اب جی کر بھی کیا کرے گی؟'' گوپی نے سرگوشی کی۔ اُنہوں نے سوچا تھا کہ راجہ بدیش جائے گا، کروڑوں روپے کما کر لائے گا۔ پھر وہ دونوں ایک بہت بڑا مکان بنائیں گے، موٹر سائیکل پر بیٹھ کر لڑکیاں چھیڑیں گے، مرضی کے کپڑے پہنیں گے اور دادی کی خوب سیوا کریں گے۔ گوپی نے تو اپنا حصّہ گروی رکھنے کا منصوبہ بھی بنا لیا، مگر دادی کی زِندگی اُن کے راستے میں رُکاوٹ تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ اِس بوڑھی سے تنگ آ کر ہی ہمارے باپ نے دُوسری شادی کی تھی.........'' راجہ نے کہا۔

''ہماری ماں کے مرنے کی وجہ بھی یہی بوڑھی رہی ہو گی۔''

اُنہوں نے اُس سے نفرت کرنے کی کوشش کی مگر پھر اُنہیں وہ تمام باتیں یاد آ گئیں جو بچپن میں اُن کے ساتھ پیش آئیں تھیں۔ اُنہیں نہ چاہتے ہوئے بھی یاد آیا کہ کس طرح وہ اُنہیں دُودھ پلاتی تھی، نہلاتی تھی، کھانا کھلاتی تھی اور سب سے بڑی بات کہ پیار کرتی تھی۔

''اگر دادی نہ ہوتی تو کسی بھی صورت میں ہم زندہ نہ ہوتے۔''

''مگر اب کیا کِیا جائے، ہماری ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہی یہی ہے۔''

''کیوں نہ اُسے آرام سے مارا جائے۔'' راجہ نے کہا۔

''وہ کیسے.........؟'' گوپی نے سوال پوچھتے ہوئے کہا۔

''چاقو سے ماریں اُسے؟''

''نہیں۔ اِس سے اُسے بڑی تکلیف ہو گی اور پھر تمہیں یاد ہو گا کہ ایک بار میری اُنگلی کو ذرا سا چاقو لگ گیا تھا تو دادی اُنگلی کو اپنے منہ میں ڈال کر گھنٹوں چوستی رہی تھی.........''

''پھر، گرا دیں چھت سے؟''

''نہیں۔نہیں۔یاد ہے ایک بار میں گرا تھا اور میرا پاؤں مڑ گیا تھا۔رات بھر اُس عورت نے میرے پاؤں کو اپنی چھاتی پر رکھا تھا۔''

''کسی طریقے سے روٹی میں زہر ملا کر دے دیں اسے؟''

''نہیں۔ایک بار میری بوا نے مجھے باسی روٹی دی تھی اور دادی دوبارہ کئی مہینوں تک اُس کے گھر نہ گئی تھی۔اُسے وہم تھا کہ یہ باسی روٹی زہر ہوتی ہے۔'' راجہ نے گوپی کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن اب کیا کریں.......؟'' وہ دونوں یہ سوچتے ہوئے گہری نیند سو گئے۔ رات بھر کروٹیں بدلتے ہوئے کئی خواب دیکھے اُنہوں نے۔

صبح ہوئی۔ وہ اچانک جاگ گئے۔ دادی کو اُنہوں نے وہاں نہ دیکھا۔ گھبرائے ہوئے چارپائی کے نزدیک گئے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ وہ مری پڑی ہے جیسے صدیوں سے سو رہی ہو۔ پھر نیچے ایک کاغذ کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا' جس پر ٹوٹے ہوئے لفظوں میں لکھا تھا۔''پیارے بچو' کپڑے کچھ دِنوں کے لئے دھو چکی ہوں۔ سویٹر دُوسرے بڑے ٹرنک میں ہیں۔ راجہ تمہیں کہہ دُوں کہ بدیش جا کر اپنی صحت کا خیال رکھنا اور کھانا بنا پڑا ہے۔ جب مجھے جلا کر آنا تو فوراً کھا لینا' بھوکے نہ رہنا۔''

***

سمندر کا پانی

گھنشام اور رام لعل بچپن کے ساتھی ہیں۔ اُن کے پیدا ہونے میں صرف گھنٹوں کا فرق تھا اور کھیل کود کرنے میں بھی تھوڑا سا فرق۔ ایک اگر ایک گز جمپ مارتا تو دُوسرا ایک گز سے کچھ زیادہ اور کبھی کبھی دوڑنے میں ایک آگے نکل جاتا تو کبھی دُوسرا۔ گاؤں کی رام لیلا میں وہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔

دونوں اچھے ایکٹر تھے۔ گھنشام کے دِل میں ایک بہت بڑا ایکٹر بننے کی خواہش تھی اور رام لعل اُس سے اچھا کلاکار تھا مگر اُس کی خواہش تھی کہ اُس کا گاؤں ایک عظیم گاؤں بنے۔ دونوں گاؤں میں رام لیلا کھیلتے تھے۔ گھنشام رام کا کردار نبھاتا تو رام لعل لکشمن کا۔ تمام گاؤں کے لوگ عش عش کرتے تھے اور پھر رام لعل تو لوگوں کے دِلوں کے اندر بس گیا تھا۔ وہ گھنشام سے اپنے آپ کو بڑا دیکھنا چاہتا تھا مگر رام لعل اُس گاؤں کو۔ اصل میں اُس گاؤں کے کچھ گھر دریا کے اُس پار تھے اور کچھ گھر دریا کے اِس پار تھے۔ سیلاب آتا تھا تو لوگوں کا جانا آنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا تھا۔ کئی دِنوں تک ایک طرف کے لوگوں کو دُودھ اور دُوسری طرف کے لوگوں کو سبزیوں کا اِنتظار

کرنا پڑتا تھا۔ کئی بار بہت سے جانور بہہ جاتے تھے۔ رام لعل کے دِل میں اُس گاؤں میں پُل بنانے کی خواہش جاگ اُٹھی۔ اُسی گاؤں میں بسنتی اور گوکل کی محبت کا قصہ بھی بہت مشہور تھا۔ دونوں ایک دُوسرے سے چُھپ چُھپ کر ملتے تھے مگر بدقسمتی سے دونوں کی برادریاں کچھ الگ تھیں۔ بڑی مشکل سے اُن کی برادریاں ایک ہوگئیں اور شادی طے ہوگئی۔ بیس تاریخ کو شادی ہوئی تھی مگر بدقسمتی سے پہلی تاریخ کو گاؤں میں سیلاب آگیا اور پھر پانی کا بہاؤ کافی تیزی میں تھا۔ نامدیو بسنتی کو چاہتا تھا' اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر بسنتی اِس بات کے لئے تیار نہ تھی۔ شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں مگر سیلاب نے سارا کام خراب کردیا۔ پھر کیا تھا' لوگوں کا آنا جانا بند ہوگیا۔ نامدیو نے اعلان کیا کہ اگر بسنتی کی شادی بیس تاریخ کو نہ ہوئی تو گاؤں میں آگ لگ جائے گی' کیونکہ ڈائین زِندہ ہوجائے گی جو بڑی قربانی کے بعد سُلائی گئی ہے اور گھروں کے اندر بچوں کو خطرہ ہوجائے گا۔ لوگوں کو ہمیشہ سے ہی بچوں سے پیار رہتا ہے۔ سب اکھٹے ہوگئے اور اعلان کیا گیا کہ زبردستی بیس تاریخ کو بسنتی کی شادی کردیں گے۔ لڑکا اگر نہ ملا تو کوئی بوڑھا' لنگڑا یا اندھا ہی تیار کرلیا جائے گا۔

تمام بوڑھوں نے داڑھیاں کالی کرنی شروع کردیں اور لنگڑے سیدھے چلنے لگے مگر نامدیو کب کسی سے پیچھے رہنے والا تھا۔ کیونکہ گوکل اُس سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اُس نے اعلان کیا کہ اگر سیلاب نہ رُکا تو وہ شادی کرے گا۔ سارے گاؤں میں نامدیو کی تعریف ہوئی اور اُس کی قربانی کا چرچہ گھر گھر ہوا۔ مگر بیس تاریخ کی صبح بسنتی نے دریا میں چھلانگ لگادی اور اُدھر گوکل نے بھی' مگر دریا نے دھوکا دیا۔ گوکل کو بہالے گیا مگر بسنتی کو اُس نے کنارے پر لگادیا۔

بسنتی دریا کے اِس طرف آگئی اور لوگوں نے اُس کو بال وِدھوا کہا اور پھر نامدیو بھی شادی کو تیار نہ ہوا۔ اُس نے اعلان کیا کہ وہ خوبصورت ضرور ہے مگر منحوس ہے۔ لوگ بسنتی کو جلانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ یہاں تک کہ اُس کے گھر کو بھی جلانے

کی تیاری کرنے لگے۔ رام لعل سے یہ برداشت نہ ہوا۔ اُس نے بسنتی سے شادی کر لی۔ گھنشام نے اُسے بہت سمجھایا کہ وہ شہر جائیں گے اور اُنہیں فلموں میں کام ملے گا۔ وہ بہت بڑے ایکٹر بنیں گے اور کئی لڑکیاں اُن کے آگے پیچھے ہوں گی مگر رام لعل نہ مانا۔ اُس نے شادی کر لی اور اعلان کیا کہ سب لوگ مل کر ایک پُل بنائیں گے۔

نامدیو گاؤں کے نمبردار کا لڑکا تھا۔ وہ گاؤں کی ہر چیز پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ وہ سمجھتا جب بھی وہ چاہے کسی کو بھی حاصل کر سکتا تھا۔ مگر اب کی بار وہ اپنے اندر شکست محسوس کر رہا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ وہ ہار گیا ہے۔

اُس گاؤں کے کئی لوگ جنگ میں مارے گئے تھے۔ رام لعل نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ یتیموں اور بیواؤں کے لئے ایک آشرم کھولے گا' جہاں پر یہ لوگ عزت و آبرو سے اپنی زندگی گزار سکیں۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک دِن گاؤں میں ایک ڈرامہ کمپنی آئی۔ اُنہوں نے گھنشام اور رام لعل دونوں کو کہا کہ وہ اُن کی کمپنی کے اندر کام کریں۔ رام لعل نہ مانا مگر گھنشام چلا گیا۔ گھنشام بہت بڑا ایکٹر بن گیا۔ اُس کی تصویریں گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھیلیں۔ جگہ جگہ اُس کے پوسٹر لگے۔ اُس نے کئی شادیاں کیں' کئی ملکوں میں گیا۔ اُس نے اپنا گھر سمندر کے ساتھ تعمیر کیا چونکہ اُس کی خواہش تھی کہ وہ سمندر کی طرح بنے۔ اِدھر رام لعل گاؤں میں پُل تعمیر کرواتا رہا۔ سڑکیں بنواتا رہا۔ نربدہ' جس کا گھر والا جنگ میں مارا گیا تھا' وہ اُس کے اسکول میں ماسٹرانی تھی جو یتیم بچوں کو وہاں مُفت پڑھاتی تھی۔ آہستہ آہستہ گاؤں کے اندر پُل بھی تعمیر ہوا جس سے لوگوں کو راحت نصیب ہوئی۔ رام لعل گاؤں کا مسیحا بن گیا۔ ایک دِن گھنشام نے اُس گاؤں کے اندر آنے کا اعلان کیا۔ سارے گاؤں کو سجایا گیا۔ رام لعل نے سب سے آگے ہو کر اُسے خوش آمدید کہنے کا پروگرام بنایا۔ سارے گاؤں میں پوسٹر لگا دیئے گئے۔ ایک بہت بڑے گیٹ پر گھنشام کا فوٹو لگایا گیا۔ شہر سے تین کلومیٹر دُور رام لعل اُس کے سواگت کے لئے گیا۔ گھنشام خود کار چلا رہا تھا۔ حادثہ ہوا۔ گھنشام زخمی ہوا۔ کار چونکہ

رام لعل کے ساتھ ٹکرائی تھی اس لئے رام لعل بھی زخمی ہو گیا۔

سارا گاؤں رام لعل کے پیچھے دوڑا۔ ''ہائے رام لعل مر گیا تو یتیم خانے کا کیا ہوگا؟ رام لعل مر گیا تو گاؤں کی کھیلوں کا کیا ہوگا؟ گاؤں کے بزرگوں کا کیا ہوگا؟ بیماروں کا کیا ہوگا؟ رام لعل کو بچاؤ۔'' سارے گاؤں میں شور مچ گیا۔ گھنشام وہاں پڑا رہا۔ گھنشام تو تمام دُنیا کا ہے۔ سارے مُلک میں اُسے بچانے کے لئے بہت سے لوگ ہیں۔ رام لعل تو گاؤں کا ہے۔ گاؤں والوں کے علاوہ اُس کا اور کوئی نہیں ہے۔ اِن آوازوں کے بیچ گھنشام کو زخمی حالت میں شہر لے جایا گیا۔

گھنشام کو لوگ شہر لے گئے اور رام لعل کی بیوی نے اُس کی خوب خدمت کی۔ اُس کے دونوں بچے اُس کے سرہانے کھڑے رہتے ہیں اور گاؤں والے اُس کے گھر کے باہر کھڑے رہتے ہیں۔ گھنشام ہسپتال میں داخل ہے۔ اُس کی ایک بیوی سوچتی ہے دُوسری اُس کی دیکھ بھال کر رہی ہوگی اور دُوسری سوچتی ہے تیسری۔ اُس کے بچے کہتے ہیں۔ ''پپا کے پاس بہت روپے ہیں وہ اپنا علاج کروالیں گے۔'' چاہنے والے سوچتے ہیں کہ اُسے کیا پرواہ ہے اُسے تو لاکھوں لوگ چاہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی اُس کی دیکھ بھال کر رہا ہوگا۔ اور وہ تو سب دُنیا کا ہے۔''

اور گھنشام اکیلا بستر پر پڑا ہے۔ گھنشام نے نوکر سے کہا۔

''پانی لاؤ۔''

''صاحب ابھی نلکا نہیں آیا ہے۔''

گھنشام نے محسوس کیا کہ سمندر کا پانی اُس کے قریب ہونے کے باوجود اُس کے کام کا نہیں ہے۔

***

موسم بدلتے رہتے ہیں

اُس کا نام حنا تھا یعنی مہندی، جو ہاتھوں کو سجاتی ہے اور شادی کی رسم کا حصہ بنتی ہے۔ مہندی جس کا ایک اپنا الگ وجود ہے۔ جس سے لوگ شادی کا کھیل کھیلتے ہیں۔ ایک دُوسرے کے ہاتھوں میں لگانے کا کھیل اور اِس کھیل میں کبھی کبھی جسم چھو جاتے ہیں اور ایک دُوسرے سے رِشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ اور مہندی رات ہمیشہ ملن سے پہلے ہوتی ہے گویا کہ کنوارے پن اور شادی کے بیچ کی رات جیسے سورج ڈوبنے اور رات کے آنے کے بیچ شفق کا آنا لازمی ہے۔ اِسی طرح مہندی رات کا ہونا ضروری ہے۔ سچ یہ بھی کہ دِن کو سورج نکلتا، پھر شام کو ڈوب جاتا ہے اور رات کو رات ہوتی ہے۔ مگر بیچ میں شفق میں کیا ہوتا ہے یہ دیکھنے سے پہلے ہی شفق ختم ہو جاتی ہے، کسی کو معلوم نہ ہے۔ ایک بوڑھے نے یہ کہانی بھی سنائی کہ محبت ہی اِس دُنیا کی بنیاد ہے اور جو آدمی پہلے اِس زمین پر آیا اُس نے محبت کی تھی اور اُسی کو دیکھ کر زمین سے پھولوں کے درخت اُگے تھے اور پہاڑوں سے دریا پھوٹے تھے۔

حنا خوبصورت تھی اور جب پھولوں کے درختوں کو پانی دیتی تو اور خوبصورت لگتی۔ لگتا کہ پانی اُچھل کر اُس کے بالوں کی لٹوں کو بھگونا چاہتا ہے۔ اِنسان چاہے ایک دُوسرے سے نفرت کرے مگر مزے کی بات ہے کہ پانی اُس سے محبت ضرور کرتا

ہے۔ آگ اُس سے محبت ضرور کرتی ہے کیونکہ آگ جلتے ہوئے اتنی گرمی پھیلا دیتی ہے کہ انسان اس کے نزدیک نہ آئے۔ حنا طرح طرح کے پھولوں کو پانی دیتی ہے تو لگتا ہے کہ آسمان زمین پر آنے کے لئے بیتاب ہو اور یہاں پر نہ آ سکتا ہو کیونکہ یہ بہت بڑا ہے۔ بڑا ہونا بھی عجیب ہے۔ آدمی اپنے وجود کو ہی سنبھالتا رہتا ہے۔ اُسے آگے پیچھے دیکھنے کا موقعہ ہی نہ ملتا ہے۔ ہر بڑی چیز زمیں پر ایک حملہ ہے کیونکہ وہ زیادہ جگہ گھیرتی ہے۔

اُدھر گُلو کمہار طرح طرح کے برتن بناتا ہے۔ مٹی کو نئی نئی شکلیں عطا کرتا ہے۔ خوبصورت برتن، رنگ برنگے برتن بناتا تو لگتا کہ مٹی کے برتن نہ بنا رہا ہو بلکہ اُسے نئی زِندگی دے رہا ہے۔ لگتا ہے کہ کائنات کا مالک بھی کمہار ہے۔ مٹی کا کھیل کھیلتا ہے۔ رنگوں کا کھیل کھیلتا ہے اور کبھی کبھی لگتا ہے کہ پھولوں کے درخت اُگانے والوں اور مٹی کے برتن بنانے والوں کا سیدھا تعلق آسمان سے ہے اور یہی تعلق آسمان کا زمین سے ہے۔ اِسی لئے بارش برساتا ہے، دُھوپ دیتا ہے۔ محبت کا یہ سلسلہ قائم ودائم ہے اور حنا جب پھولوں کو پانی دیتی ہے تو لگتا ہے گویا کہ شبنم خود زیور بن کر اُس کے بدن سے لپٹ رہی ہو۔ پھول برسانا بھی کیا چیز ہے۔ اوتاروں اور پیغمبروں پر برسائے جانے والے پھول حنا نام کی مالنیں ہی اُگاتی ہیں اور گندی سے گندی مٹی میں بھی یہ اُگتے ہیں۔

نہ جانے کیوں ایک دِن گلی کے بیچ چلتے ہوئے حنا اور گُلو کی آنکھیں ٹکرا گئیں۔ لگا کہ پھول اور برتن ٹکرا گئے ہوں یا پھول مٹی کے برتنوں سے اپنا وجود ظاہر کرنا چاہتے ہوں۔ حنا سیدھی گُلو کی دوکان پر گئی اور وہاں کھڑی ہوگئی اور گُلو کو دیکھنے لگی۔ اُسے لگا کہ گُلو برتن نہ بنا رہا ہو بلکہ پھول بنا رہا ہو۔ مگر اُسی وقت اُسے یاد آیا کہ پھول اُس کا اِنتظار کر رہے ہیں اور اُسے تو ہر حال میں اُنہیں پانی دینا ہے۔ وہ جانے لگی مگر گُلو نے کہا "صرف یہاں کھڑی رہو۔"

"مگر کیوں؟"

"تمہارے بدن کی وجہ سے مٹی کے برتن پھولوں کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔"

"مگر مجھے جانا ہے۔" اِس سے پہلے کہ گلو اپنی بات آگے بڑھاتا' حنا نے اچانک کہا "میں صرف پانی دیتی ہوں مگر پھولوں کی مالک زمین ہے۔" گلو چپ ہو گیا۔ پھر اُس نے کہا "خوشبو کی مالک؟"

"خوشبو کی مالک ہوا ہے۔"

پھر مٹی اور پھولوں کی محبت کا سلسلہ آگے بڑھا۔ ہوا خوشبو کو گلو تک پہنچاتی رہی اور زمین کی مٹی حنا تک گلو کی محبت کا پیغام پہنچاتی رہی۔ محبت کی کہانی اور آگے بڑھنا شروع ہوئی۔ وہ پھول اُگاتی رہی اور وہ مٹی کے برتن بناتا رہا۔ مٹی سے پھول اُگتے رہے اور پھولوں سے مٹی کی خوشبو ظاہر ہوتی رہی۔

بات جب آگے بڑھی تو جانے کیا ہونے لگا کہ گلو جب مٹی کے برتن بناتا تو اُن کی شکل خود بخود پھولوں جیسی ہو جاتی۔ برتنوں کی شکلیں پھولوں جیسی' گلاب کے پھولوں جیسی' گھٹے کے پھولوں کی طرح' اور ہر قسم کے پھولوں کی طرح اور ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ آگے بڑھنے لگا اور بڑھتا ہی گیا۔ ہوا چلتی ہے۔ پھول ایک دُوسرے سے ٹکراتے ہیں اور حنا نیلے پیلے کپڑے پہن کر جب پھولوں کے درختوں کو پانی دیتی ہے تو سورج اُسے یوں چومتا ہے کہ گویا کہہ رہا ہو کہ پھولوں کی کیاریوں پر اُن کا ہی حق ہے جو اُنہیں پانی دیتے ہیں اور حنا جب اُن پھولوں کے درختوں کو چھوتی ہے تو اُن کی جڑوں میں ایک عجیب سی ہل چل پیدا ہوتی ہے۔ جس سے لگتا ہے کہ زمین کی مٹی کہہ رہی ہو گلو تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اِس طریقے سے جب گلو مٹی کے برتن بناتا تو لگتا کہ مٹی خود بخود اپنے آپ کو پھولوں میں ڈھال رہی ہو اور لگتا کہ پھولوں کا عکس کہہ رہا ہو کہ تمہارا حنا سے یعنی کے پھولوں سے رِشتہ یگوں یگوں سے ہے اور یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ اگر مٹی اور خوشبو کا رِشتہ قائم ہو جائے تو کسی کو بھی سورگ میں نہ جانا پڑے گا بلکہ زمین ہی سورگ بن جائے گی۔ مگر سچائی یہ بھی ہے کہ ایک اور کہانی بھی چل رہی ہے۔

دراصل حنا کا بھائی بنجاروں کا کام کرتا ہے۔ وہ چوڑیاں بیچتا ہے۔ گلی گلی گھومتا ہےاورزورزور سے کہتا ہے۔

''خوبصورت چوڑیاں خریدو' رنگ برنگی چوڑیاں خریدو' نیلی نیلی چوڑیاں خریدو۔'' وہ ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے گزرتا ہے جن کے دونوں طرف رہنے والے لوگوں کے اپنے سلسلے ہیں' اپنے طریقے ہیں۔ وہ ہرروز صبح اُٹھتا' چوڑیوں کو صاف کرتا۔ اِس طریقے سے رکھتا کہ جب وہ چلے تو چوڑیاں کھنکیں اور اُن سے ایک آواز پیدا ہوتا کہ لوگوں کے دِل ڈھل جائیں۔

نہ جانے ایک دِن کیوں حنا کے دِل میں ایک عجیب وغریب خیال آیا۔ اُس نے پھولوں کا ایک گلدستہ بنایا۔ ہر کیاری سے ایک ایک پھول لیا اور اپنے بھائی ساھدو سے کہا کہ وہ یہ گلدستہ گلو کمہار کو دے دے۔ کچھ بات ہے کہ لوگ گلشن کمار کو گُلو کہتے ہیں۔ گویا کہ گلشن گلو ہونا چاہئے کیونکہ وہ مٹی کا کھیل کھیلتا ہے اور مٹی کو لوگ ایک نمبر ضروری چیز سمجھتے ہیں۔ مگر حنا اُسے پیار سے گُلو کہتی ہے۔ حنا سمجھتی ہے کہ وہ گلو سے پیار کرسکتی ہے' اُس کے بال نوچ سکتی ہے' اُس کی آنکھوں میں سُرمہ لگا سکتی ہے۔ وہ نہا رہا ہوتو اُس کے کپڑے چُرا سکتی ہے مگر یہ سب کچھ وہ گُلشن کمار کے ساتھ نہ کرسکتی ہے۔ اِس لئے وہ اُسے گُلو کہنا ہی پسند کرتی ہے۔ بس ساھدو یعنی کہ حنا کا بھائی وہاں چلا گیا اور گُلو کی دوکان کے آگے کھڑا ہوکر اُسے گلدستہ دینے لگا۔ مگر گلو کی بہن نیماں وہاں پر آ گئی۔ ایک ہی جھلک میں ساھدو کو اپنی چوڑیاں ٹوٹتی ہوئی نظر آئیں اور لگا کہ اُس کی آنکھوں پر اُس کا کنٹرول نہ ہے۔ لگا کہ مٹی کے برتن ریت کے ہوں اور چاندنی گرم ہو۔ نیماں بھی اُسے دیکھتی گئی۔ نیماں کے ہاتھوں میں کناریاں دیکھ کر ساھدو اور پریشان ہوگیا۔ نیماں ساھدو کی طرف دیکھنے لگی اور دیکھتی ہی گئی۔ نیماں کے منہ سے لفظ پھوٹے۔

''تم بنجارے ہو؟''

''ہاں۔'' ساھدو نے جواب دیا۔

''میں دوپٹوں کو کناری لگاتی ہوں، طرح طرح کی کناری، نیلی پیلی کناری، رنگ برنگی کناری۔'' نیماں نے یوں بات کی جیسے کناری اور چوڑی کا آپس میں کوئی رِشتہ ہو۔ ''اچھا نہ ہوگا تم اور میں اِکھٹے پھیری لگائیں۔'' ساھدو نے کہا۔

''کیوں نہیں۔''

یہ سن کر گُلو زمین پر زور سے مٹی مارنے لگا گویا کہ اِکھٹے پھیری لگانے کے خلاف اِحتجاج کر رہا ہو۔ مٹی کے برتن بناتے ہوئے زور زور سے بولنے لگا کہ اُن کی محبت کے خلاف نعرے لگا رہا ہو۔ نیماں پیلے رنگ کی شلوار اور نیلے رنگ کی قمیض پہن کر، ہاتھوں میں رنگ برنگی نیلی پیلی خوبصورت کناریاں لے کر باہر آئی اور وہ سب اُس نے ساھدو کو دِکھائیں۔ ساھدو نے بھی اُس کے آگے چوڑیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ پھر وہ دونوں بازار کے اندر چلے گئے۔ چوڑیوں اور کناریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر روز خوبصورت و نازک لڑکیاں وہاں پر آتیں اور اپنی بانہوں پر چوڑیاں چڑھاتیں اور پھر عورتیں کئی قسم کے دوپٹے لاتیں اور اُن پر نیماں کناریاں لگاتی۔ پھر سلسلہ آگے بڑھا اور بازار کی رونق بھی بڑھنے لگی۔ لوگ آنے لگے۔ طرح طرح کے کپڑے پہن کر عورتیں آتیں اور پھر بازار یوں ہی سجایا جاتا۔ اُدھر گُلو جو بھی برتن بناتا اُن کی شکلیں پھولوں جیسی خود بخود ہو جاتیں اور حنا جن پھولوں کو اُگاتی اُن کی شکلیں گُلو کے برتنوں جیسی ہو جاتیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور چلتا ہی گیا۔ اُدھر جن بانہوں پر ساھدو چوڑیاں چڑھاتا، لگتا کہ اُن عورتوں کے دوپٹوں پر کناری خود بخود چڑھ رہی ہو۔ نیماں دوپٹوں پر کناری لگاتی تو چوڑیاں خود بخود کھنک اُٹھتیں۔ اُن کے جسم تھر کنے لگتے۔

مگر موسم کب کسی کا لحاظ کرتے ہیں۔ وہ بدلتے رہتے ہیں۔ گُلو نے سوچا کہ ایک دِن ضرور حنا کے پھول اُس کے آنگن میں اُگیں گے اور اُدھر حنا نے سوچا کہ ایک دِن ضرور اُس کے گھر میں گُلو کے بنائے ہوئے برتن ہوں گے۔ مگر وہ اِس بات کو بھول گئے تھے کہ موسم بدلتے رہتے ہیں۔ موسموں کے بدلنے کا اثر اِنسان پر ہوتا ہے اور اِس

زمین پر ہر جگہ ایک جیسے موسم نہیں ہیں۔

نیماں نے سوچا کہ وہ ضرور ایک دِن بنجارے کی زِندگی کے دوپٹے پر کناری لگائے گی اور ضرور اُس کی صبح ایک دِن چوڑیوں کی کھنک سے شروع ہوگی۔

شہر کے راجہ کے دربار میں اُس بازار کا چرچہ ہوا۔ رانیوں کو معلوم ہوا۔ ایک دِن ایک رانی آئی اور اپنی بانہوں پر چوڑیاں چڑھانے کے لئے بنجارے کو ساتھ لے گئی۔ ساھد و چلا گیا۔ کہاں گیا معلوم نہ ہے۔ کب آئے گا معلوم نہ ہے۔ مگر نیماں آج بھی اُس کا اِنتظار کررہی ہے۔ اُدھر دُوسری رانی کے بیٹے کو پھول پسند ہیں۔ وہ حنا کو لے گیا اور کہنے لگا کہ اپنی کیاری سجائے گا۔ اُس کے بعد آج تک حنا کا کوئی پتہ نہ ہے۔ اب گُلومٹی کے برتن نہ بناتا ہے بلکہ کچے گھڑے بناتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے اِنہیں مت خریدو، یہ کچے ہیں۔ نیماں اب دوپٹوں پر کناریاں نہ لگاتی ہے بلکہ اپنے راستے میں کوئی بھی چوڑی مل جائے تو توڑ دیتی ہے اور سب ایک دُوسرے سے کہتے ہیں کہ موسم بدلتے ہیں۔ جب بھی محبت کرو اِس بات کو سمجھ کر کرو۔

***

پھیکے آم

آموں کے درختوں کے بیچ جب ہوا گزرتی تو لگتا دوپہر میں چاندنی اپنی پہچان بنا کر سیر کر رہی ہو اور لڑکیوں کا جھرمٹ جب اِن درختوں کی چھاؤں میں بیٹھتا تو آم ٹہنیوں سے نیچے گر پڑتے۔ لگتا کہ اُن کا خیر مقدم کرنا چاہتے ہوں۔ ٹہنیوں پر لگے ہوئے آم لگتا ہے کہ وہ لفظ ہیں جو اِنسان نے زمین پر آ کر سب سے پہلے بولے تھے۔ پتے اِن آموں کو کس طرح چھپاتے ہیں یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا مگر اِتنا ضرور ظاہر ہو گیا ہے کہ یہاں پر ہر چیز ایک دُوسرے کی غلام ہے۔ موسم وقت کا' دُھوپ رات کی' بہار خزاں کی اور آم موسموں کے۔

لڑکیوں کے جھرمٹ میں سے ایک لڑکی سریتا جب چلتی تو لگتا آم' گتھے اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو چُرا کر بکھیر رہے ہوں۔ سریتا اِسی محلے میں پلی اور بڑی ہوئی تھی۔ لڑکیاں چھپ کر یہاں بیٹھتیں' باتیں کرتی اور چلی جاتیں۔ پتے ہلتے تو لگتا گویا آم بھی اِن کی باتوں میں شامل ہوں۔

وہ آموں کو چھوتی نہ تھیں۔ اِن آموں کا مالک گملا سنگھ پورا کانٹوں کا درخت

تھا۔ جہاں سے چھوؤ درد دیتا تھا۔ بات کرتا تو لگتا کہ لفظ چبھو رہا ہو۔ آنکھ ملاتا تو محسوس ہوتا کہ دھمکی دے رہا ہو۔ چلتا تو لگتا کہ لڑنے کے لیے آرہا ہو، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان خوبصورت آموں کا مالک گملا سنگھ ہے جو اُس گملے کی طرح ہے جس میں جتنا مرضی پانی ڈالو اُس کی مٹی ہمیشہ سوکھی ہی رہے گی۔

گملا سنگھ کو نہ ہی آموں کے درختوں سے پیار ہے، نہ ہی اُن کی خوشبو سے، نہ ہی اُسے آم دیکھنے کا شوق ہے اور نہ ہی آم کھانے کا۔ بس اُس کا ایک باغ ہے جہاں سے وہ پیسے کما کر شراب پیتا ہے۔ گملا سنگھ کی بس اتنی ہی کہانی ہے۔ کبھی کبھی جیسے وہ شراب خانے میں جاتا ہے، کوٹھے پر جاتا ہے، اِس باغ میں بھی آجاتا ہے۔ آم اُتارتا ہے، دانتوں سے کاٹتا ہے پھر چھوٹے آموں کو نگلتا ہے۔ یہ سب وہ اِس لیے کرتا ہے تاکہ آموں کو بتا سکے کہ وہ اِس کے ہیں اور وہ جو بھی چاہے کر سکتا ہے ورنہ نہ اُسے آم کھانے کا شوق ہے اور نہ ہی آم دیکھنے کا۔

''آم کہاں سے آتے ہیں، پھول کہاں سے آتے ہیں، پتے کہاں سے آتے ہیں۔ پہلے موسم مر جاتے ہیں یا پھر وہی دوبارہ آتے ہیں۔'' یہ سوال بچپن سے ہی نند کے دِل میں اُبھرتے تھے اور پھر اُس نے گڈے کا کھیل کھیلنے والی لڑکیوں کو اپنی آنکھوں سے جوان ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ سب لڑکیاں جوان ہوئیں مگر نہ جانے کیوں سریتا اُس کے دِل میں بس گئی تھی اور سریتا اُس کے دِل میں اِس طرح بسی تھی جس طرح آم خوشبو کے بدن میں۔ نند کالج میں پڑھتا تھا مگر جب وہ آٹھویں میں پہنچا تو اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ سریتا کو آم پسند ہیں۔

نند نے اپنے آنگن میں آموں کے درخت لگائے۔ وہ درخت بڑے ہو گئے۔ اب وہ خوش تھا کہ اب سریتا اُس کے باغ میں آیا کرے گی۔ اُس کے آموں کی خوشبو سونگھا کرے گی اور جب سریتا اُس کے آموں کی خوشبو سونگھے گی تو اُسے لگے گا کہ جیسے سمندر خود ہی صحرا کو پانی دینا چاہتے ہوں یا کالی رات کہیں سے چاند کو چُرا کر

لائی ہو۔ بہت خواب دیکھے اُس نے ۔ یہ بھی سوچا تھا کہ جب اُس کے لگائے ہوئے آموں کو سریتا کے لب چھوئیں گے تو اُس کے بدن میں خون بہت تیزی سے دوڑے گا۔ جب سریتا کی اُنگلیاں اُس کے لگائے آموں سے ٹکرائیں گی تو لگے گا اُس کی زِندگی کی راتیں دِنوں کے بغیر ہوں گی۔

سچ تو یہ ہے کہ یہاں کسی کے بس میں کچھ نہیں۔ رات اگر رات رہنا بھی چاہے تو نہیں رہ سکتی۔ پیار کی بھی ایک عمر ہے۔ نند کی یہ خواہش تھی کہ درخت بڑے ہو گئے ہیں اب سریتا ضرور وہاں پر آئے گی مگر آم ابھی پکے بھی نہ تھے کہ بِک گئے۔ ہوا یوں کہ نند کے بڑے بھائی کی لڑکی کی شادی کے لیے جب روپیوں کی ضرورت پڑی تو تلوار آموں پر گری یعنی کہ باغ بِک گیا اور وہ سارا گملا سنگھ کا ہو گیا اور نند' گملا سنگھ کا ملازم ہو گیا۔ یوں لگا کہ پھولوں کو کانٹوں کی حفاظت کرنی ہے اور زندگی کا ساز بے سُر ہو گیا۔ یہ بھی لگا کہ آموں کی خوشبو ختم ہو گئی۔ اب نند' گملا سنگھ کا مالی بن گیا۔

سریتا ہر روز وہاں پر آتی اور آموں کے درختوں کے نیچے بیٹھتی۔ نند اُس کی آنکھوں میں آموں کے درختوں کے پتوں کے خواب دیکھتا۔ آموں کے درختوں کے پتوں کے بھی خواب یہی ہوں گے کہ وہ کسی گلاب کے پھولوں کے پتے بنیں۔ مگر پتے پھر یہ سوچ کر کہ وہ جس درخت پر مرضی نکلیں' ایک دِن اُنہیں گرنا ہے' اپنی خواہشوں کو دبا لیتے ہیں۔

نند کو اُن آموں کی حفاظت کرنی پڑ رہی تھی جو گملا سنگھ کے تھے۔ ایک دِن نہ جانے کیا ہوا اُس نے آموں کو توڑا اور سریتا کو پیش کرنے لگا۔ یوں لگا جیسے سورج' چاند کو چاندنی رات کے کٹورے میں ڈال کر روپہلی رات کو پیش کر رہا ہو اور درخت کے پتے نغمے گا رہے ہوں اور لگا کہ ایک ایک پتے نے نند کے اِس قدم کی تائید کی ہو۔ گویا زور زور سے کہہ رہا ہو۔ ''تُم ٹھیک کر رہے ہو۔''

جو آم نند نے توڑے وہ گیلے ہو گئے۔ لگا کہ خوشی کے آنسو بہا رہے ہوں اور

جو آم وہ توڑ نہ سکا اُن کے پتوں نے ہلنا بند کر دیا گویا کہ اِس بات کے خلاف احتجاج کرر ہے ہوں۔ پھر ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گھٹے کے پھولوں کی خوشبو لایا' جو آموں کی خوشبو میں مل گئی۔ پھر ہوا گلاب کے پھولوں کی خوشبو لائی، پھر موتئے کے پھولوں کی۔ آموں کے پتوں کی خوشبو میں جب یہ خوشبوئیں ملیں تو لگا کہ خوشبوؤں کا سوم رس تیار ہو رہا ہے۔ اور جب سریتا کے سانس اِس میں ملے تو نشہ اِتنا زیادہ ہو گیا کہ محسوس ہوا کہ سورج کی کرنیں اب اپنی مرضی سے زمین پر گھوم پھر سکیں گی ......اور نند تو بہہ گیا اِس نشے میں۔

وہ دِن رات پاگلوں کی طرح باتیں کرنے لگا اور کہنے لگا کہ جیسے آموں کی بے شمار قسمیں ہیں مگر ہیں تو آم۔ اِسی طرح سریتا سے پیار کرنے کے بھی بے شمار طریقے ہیں مگر ہے تو پیار۔ کبھی یہ پیار اِظہار کر کے کیا جاتا ہے' کبھی چھپا کر' کبھی آم توڑ کر' کبھی آم دیکھ کر' کبھی آم سونگھ کر اور کبھی آموں کا ذکر کر کے۔ سریتا اور آم اُسے ایک ہی جیسے لگے۔ اُسے لگا کہ وہ آموں کا بھی مالی ہے اور سریتا کے حُسن کا بھی نگہباں۔

ایک دِن نند کی باہوں میں سریتا کی باہیں تھیں۔ لگتا تھا کہ ہزاروں خواہشیں عمر کے درختوں پر اُمڈ آئی ہیں۔ آموں کی طرح' جو صرف ٹوٹنے کے لیے لٹکے رہتے ہیں۔ کوئی اگر نہ توڑے تو خود گر جاتے ہیں۔

مگر طوفان جب آتا ہے اور ہوا آموں سے ٹکراتی ہے تو وہ گرتے ہیں' کچے پکے' چھوٹے بڑے' کئی قسموں کے آم گرتے ہیں۔ کچھ ٹوٹ جاتے ہیں۔ اُس روز کملا سنگھ طوفان کی طرح آیا۔ اُس نے سریتا کو نند کی باہوں میں دیکھا۔ اُس نے بغیر کسی وجہ کے ایک کچا آم توڑا۔ نند نے کہا۔ ''صاحب کچا ہے۔'' کملا سنگھ نے نند کو گھور کر دیکھا' وہ چُپ ہو گیا۔

پھر جیسے طوفان ہی آ گیا۔ سب آم ٹوٹنے لگے۔ کچے پکے' کچھ داغی ہو گئے۔ لگا کہ کملا سنگھ کے خلاف احتجاج کرر ہے ہوں۔ اُس نے ایک آم کو اُٹھایا۔ چھلکا اُتارا

اور تھوڑا سا چکھ کر پھینک دیا۔ پھر اُس نے سریتا کو بھی اِسی طرح اپنی ہوس کا شکار بنایا اور جاتے ہوئے نند سے صرف اِتنا کہا۔

''یہ گرے ہوئے آم اکٹھے کر لینا کم قیمت میں بِک جائیں گے۔''

سریتا نے مرتے ہوئے صرف اِتنا کہا۔'' اُس کی لاش نند کے باغ میں گرے ہوئے آم کے درختوں کی لکڑیوں سے جلائی جائے۔''

اِس کے بعد سے لے کر آج تک اِس بستی کے آم پھیکے ہیں۔ گو یہاں کے رہنے والوں کو اِس کا کوئی احساس نہیں ہے کیونکہ اُن کے ذائقے ہی پھیکے ہو گئے ہیں............ساتھ کے گاؤں والے ایسا ہی کہتے ہیں۔

***

رانی، رانی غم خوار

ایک چھوٹی سی بچّی، جو بڑی خوبصورت تھی، ہر ایک کو پسند تھی۔ مگر نہ جانے کیوں ہمیشہ دُوسروں کے آنگن میں کھیلنا پسند کرتی تھی۔ اُس کا باپ وشوانا تھ بھی اُس سے از حد پیار کرتا تھا اور ماں بھی۔ یہاں تک کہ اُس کا بڑا بھائی گوبند بھی اُسے کچھ زیادہ ہی چاہتا تھا۔ سب نے مِل کر ایک سلسلے کو جنم دیا تھا۔ وہ اِتنی اچھی تھی کہ ہر گھر کے لوگوں نے اُسے اپنا ایک نام دے دیا تھا۔ کوئی اُسے گوراں کہتا، کوئی گڈی، کوئی سمتا، کوئی سکینہ اور کوئی حسینہ۔ ہر آنگن میں جا کر وہ گھسیٹی کرتی تھی۔ صبح جہاں چائے ملتی، پی لیتی اور بعد میں دوپہر کا کھانا، جس گھر میں ہوتی، اُسی گھر میں کھالیتی۔

اُن ہی دِنوں ایک واقعہ ہوا۔ رانی کی ایک سہیلی کرشمہ کی ماں مرگئی۔ کرشمہ اپنی ماں کی چھاتیوں سے دُودھ پیتی تھی۔ کرشمہ بیمار ہونے لگی مگر رانی ایک دِن کرشمہ کو اپنے گھر لے آئی۔ پھر اپنی ماں کی چھاتیوں کو ننگا کیا اور کرشمہ کو دُودھ پلایا۔ اب ہر روز کا یہ سلسلہ آگے بڑھنے لگا۔

اُس کی اِن عادتوں سے اُس کا باپ کافی حیران تھا۔ مگر اُس کی یہ عادتیں پسند بھی کرتا تھا اور فکر مند بھی تھا۔ رانی اور بڑی ہوئی۔ وہ اسکول میں داخل ہوئی مگر اُس

کی تمام عادتیں بدستور قائم رہیں اور پھر اُس کا نام کرن محلے کے لوگوں نے اِس طرح سے کیا' رانی........رانی' جو اوروں کے دُکھ نہ سہہ سکے۔ یہ اُس کی طبیعت تھی۔

کبھی ایسا لگتا کہ رانی ہی اِس زمین کی اصل باشندہ ہے۔ کیونکہ جو اِس زمین کے پہلے اور اصل باشندے تھے' وہ زمین کے بارے میں سوچتے تھے۔ وہ زمین کی تقسیم کے بارے میں نہ سوچتے تھے۔ اُن کے اپنے کوئی گھر نہ تھے۔ محلے نہ تھے' شہر نہ تھے بلکہ زمین تھی۔ رانی بھی نہ چاہتے ہوئے صرف زمین کے بارے میں ہی سوچتی تھی۔

وقت اور آگے بڑھا۔ رانی کے آنگن میں اُس کے لگائے ہوئے پودے بھی جوان ہو گئے اور اُن پر پھول آ گئے۔ رانی نے ایک دِن زور سے کہا۔

''دیکھو.......دیکھو.......میرے اُگائے ہوئے درخت پر گلاب کے پھول اُگ آئے ہیں۔''

پھر رانی نے اپنے بدن کو دیکھا' لگا کہ اُس پر بھی پھول اُگ رہے ہوں۔ اُس نے اپنی قمیض ایک دم اُتار دی اور زور سے کہنے لگی۔

''دیکھو.......دیکھو.......میرے بدن پر بھی گلاب کے پھول اُگے ہیں۔''

اُس کا باپ وشوا ناتھ دوڑا اور ماں سے بڑی مُشکل سے قمیض ڈلوائی گئی اور پھر رانی ایک دِن سکول میں فرسٹ آئی۔ اُس کی سہیلی گوپا' جو کہ ایک بہت بڑے آفیسر کی لڑکی تھی' رونے لگی۔

''کیا بات ہے......؟ تُم رو کیوں رہی ہو.......؟'' رانی نے پوچھا۔

''بات ہی کچھ ایسی ہے۔''

''پھر بتاؤ تو سہی۔''

''کیا بتاؤں.......؟ تم غریب ہو کر بھی فرسٹ آئی ہو اور میں امیر ہو کر بھی صِرف پاس ہوئی ہوں.....میرے پاپا مُجھ کو نہیں چھوڑیں گے....وہ مجھے ماریں گے۔''

گوپا نے روتے ہوئے رانی سے کہا۔

یہ سُن کر رانی اپنے اُستاد کے پاس گئی اور کہا کہ ایک سوال تو اُسے گو پانے کر کے دیا تھا۔ اُس نے فوراً اُس کے نمبر بدلوائے۔ رانی گھر گئی، اُسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ رانی اِس طریقے سے آگے بڑھتی رہی........ بڑی ہوتی گئی۔

مگر اُس کا والد وشوا ناتھ اُس کی حرکتوں سے کافی پریشان تھا۔ وہ دُوسروں کا اسکول کا کام کر دیتی تھی اور اپنا کھانا لوگوں کو کھلاتی تھی۔ صبح چڑیوں کو دانا ڈالتی۔ پھر کیا تھا ایک دِن وشوا ناتھ کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ یہ اُس دِن کی بات ہے، جس دِن رانی نے ایک کاپی پر ایک شعر لکھا اور شاعرہ بن گئی۔

اسکول گئی تو اُستاد نے ایک تخلص دے دیا.........

اور اب وہ رانی، رانی غم خوار بن گئی۔ ایک کاپی اور پین ہمیشہ اُس کے پاس تھا۔ بازو عجیب قِسم کے تھے۔ اُنگلیاں جیسے ہاتھوں کی بناوٹ کے مطابق بنائی گئیں ہوں۔ صبح اُٹھتی تو لگتا کہ رات کو سیاہی نے اُس کا چہرہ دھویا ہو۔ چلتی تو محسوس ہوتا کہ ہوا اُس کے ساتھ چلتی ہے۔ کالج کے لڑکوں کا جھرمٹ اُس کے اِرد گرد گھومتا۔ یہاں تک کہ لوگ رانی سے ننگے مذاق کیا کرتے تھے۔ مگر وہ چُپ رہتی۔ کالج کے لڑکے اپنی سوچ کی ساری گندگی اُس پر نکالتے۔ گندگی یعنی کہ لفظوں کے ذریعے وہ گندگی جو اُن کے دِلوں کے اندر پیدا ہوتی ہے اور پھر لڑکیوں کے خوبصورت بدن دیکھ کر الفاظ اور جملے بن کر نکلتی ہے۔

مگر رانی سب سے الگ خوشی سے سب کچھ برداشت کرتی۔ محسوس ہوتا کہ رانی پر اِن باتوں کا کوئی اثر نہ ہے۔ بلکہ وہ تو دُنیا کا ہر زہر پی کر دُنیا کو امرت دینا چاہتی ہے۔ رانی عجیب طریقے سے چلتی۔ لڑکے اُس کے بدن کے بارے میں باتیں کرتے۔

''نہاتے ہوئے کیسی لگتی ہوگی......؟''

''رات کو سوتے ہوئے کیسے لگتی ہوگی.......؟''

''آؤ آج رات..........'' رانی کے بارے میں لوگ طرح طرح کی باتیں

کرتے۔ رانی کی سہیلی نربدا بہت خوبصورت تھی۔ وہ انشو نام کے لڑکے سے پیار کرتی تھی۔ ایک دن رانی کو نربدا نے کہا کہ وہ انشو سے ملنے جارہی ہے۔ جماعت میں میری حاضری لگوادینا۔ رانی نے کہا کیوں نہیں۔ وہ ایسا ضرور کرے گی۔ جب اُستاد جماعت میں حاضری لگانے لگا اور نربدا کا نام آیا تو اُستاد نے دیکھا کہ رانی نے لیس سر کہہ دیا۔ اُس کے بعد ٹیچر لگا تار رانی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دیکھتا ہی گیا۔ پھر جب رانی کا نام اُستاد نے بُلایا تو رانی کچھ نہ بول سکی۔ اُس کی غیر حاضری لگ گئی۔ اُس کے بعد کالج کی طرف سے اُس کے گھر نوٹس چلا گیا۔ سارے محلے نے باتیں کیں۔ رانی کالج میں ہوتی ہی نہیں ہے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتی رہتی ہے۔ وہ تمام لڑکیاں جن کو رانی کے خوبصورت ہونے کی حسد تھی، رانی کے خلاف باتیں کرنے لگیں۔ رانی کے گھر والوں نے اُسے مارا بھی۔ اور تو اور نربدا نے بھی اُس کے بارے میں باتیں کیں۔ مگر رانی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ایک سہیلی سے کہنے لگی ''شِو کا مطلب ہے دُنیا کا زہر پی کر سب کو امرت دینا۔'' اب وہ رانی غم خوار کے نام سے کالج میں مشہور ہوگئی۔

بس پھر ایک دِن وہی ہوا جو ہر عورت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی اُس کی شادی ہوگئی۔ لوگ اُس کے ساتھ سے جان بوجھ کر گزرتے تا کہ اُس کا بدن اُس کے اُبھاروں کے ساتھ چھو جائیں۔ وہ صرف اس پر ہنستی اور کہتی۔ ''اِس جسم نے آخر ایک دِن ختم ہو جانا ہے۔ جو مزا لیتے ہیں، اُن کو مزا لینے دو۔'' پھر ایک دِن وہ ایک اسکول میں ماسٹرانی بن گئی۔ صبح اُٹھتی، سب کا کھانا تیار کرتی اور پھر گھر کی صفائی کرتی۔ اُس کی دیورانی اور جیٹھانی اُسے بیوقوف سمجھتیں۔ اُسے پاگل سمجھتیں۔ اصل میں سب کو معلوم تھا کہ رانی دُوسروں کے لئے مرتی ہے۔ اِس لئے اُس کی شادی ایک نیم پاگل سے کر دی گئی۔ اُس کا دیور اُس کی خوبصورتی سے پریشان تھا، مگر سماجی بندھن کی وجہ سے چُپ تھا۔ پھر وہ کسی مشاعرے میں چلی جاتی، باقی شاعروں کو داد دیتی اور جب وہ شعر پڑھتی تو لوگ اُس کا مذاق اُڑاتے۔ مگر وہ سب کچھ ہی خوشی سے برداشت کرتی۔ سب اُسے

بیوقوف سمجھتے۔ اسکول میں جو ماسٹرانیاں نہ آتیں، وہ اُن کی کلاسیں بھی پڑھا لیتی۔ بچوں کو گلیوں کوچوں میں مُفت سوال سمجھاتی۔ ایک بار اسکول کے لڑکے نے اُس کی قمیض کا بٹن توڑ ڈالا مگر اِس بات کا اُس پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اُس کا بدن ننگا ہو گیا۔ کئی دِنوں تک رانی نے وہی قمیض پہنی رکھی۔ ایک دِن اسکول میں کام کرنے والی بائی نہ آئی تو صفائی تک کر دی رانی نے۔

محلے کے اندر اگر کسی نے سنیما دیکھنے جانا ہوتا تو بچوں کو اُس کے پاس چھوڑ دیتے۔ اُس کا خاوند کسی بھی بات کی پرواہ نہ کرتا ہے۔ اُسے صرف اُس کی تنخواہ سے مطلب ہے۔ اِس لحاظ سے وہ خوش قسمت بھی ہے۔ وہ ہر محفل میں جاتی ہے، وہاں اپنے شعر سُناتی ہے اور لوگوں کے شعر سُن کر داد دیتی۔

اُس کے گھر کے ساتھ اوناش لعل کا گھر ہے۔ اوناش لعل اپنے بچوں کے ساتھ وہاں پر رہتا ہے۔ نہایت ہی شریف آدمی ہے۔ اپنے بچوں سے اُسے از حد پیار ہے۔ ایک حادثہ یہ ہوا کہ اوناش کی بیوی مر گئی۔ اُس کے بعد اوناش لعل کی بیٹیوں نے اوناش لعل کا پورا خیال رکھا۔ وہ تحصیل دار کے دفتر میں کلرک کا کام کرتا تھا اور شریف آدمی تھا۔ اوناش لعل کے بچوں کو بھی اُس کے ساتھ از حد پیار تھا۔ ایک دِن ایک بوڑھی اوناش لعل کے گھر آئی۔ بوڑھی نے کہا

''اور سب تو ٹھیک ہے مگر تُمہارے پپا کو رات کو نیند نہیں آتی ہے۔'' دونوں بہنیں سمجھ گئیں اور پریشان ہوئیں۔ وہ رونے لگیں۔ دِن بھر پریشان رہیں اور شام کو وہ رانی کے ساتھ ملیں۔ رانی نے اُن کے آنسو پونچھے۔ رانی غم خوار ساری بات سمجھ گئی۔ اُس رات رانی، اوناش کے بستر پر گئی۔ صُبح اوناش بہت خوش تھا۔ پھر ہر تیسرے چوتھے دن رانی اوناش کے پاس چلی جاتی۔ مگر ایک دن رانی پکڑی گئی۔ مگر تب تک اوناش بوڑھا ہو گیا تھا۔ لوگوں نے اُسے خوب مارا، اُس کی بے عزتی بھی کی، مگر اس بات کا رانی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اوناش لعل والی بات کو پھیلا کر رانی کو ایک چکلے پر بٹھا دیا گیا، جہاں

رانی ناچتی گاتی۔ بڑے بڑے لوگ وہاں آتے۔ رانی کے نیم پاگل خاوند پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔ ناچتے گاتے رانی بوڑھی ہوگئی۔

پھر اُسے چکلے سے نکال دیا گیا۔ وہاں پر ایک اور خوبصورت لڑکی آگئی۔ رانی اور بوڑھی ہوگئی۔ اب وہ ایک گلی میں پڑی رہتی ہے۔ وہ جس پھول کو ہاتھ لگاتی ہے اُس پر نکھار آجاتا ہے۔ جس بچے کو چھوتی ہے وہ ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ بوڑھی ہوگئی ہے مگر بہت خوبصورت لگتی ہے۔ ایک عجیب سی خوشبو اُس کے بدن سے آتی ہے۔

***

دُوسری بے اِنصافی

اجیت سنگھ کافی غصّے سے گاڑی سے اُترا اور اُس نے ایک شخص کو زور سے مُکہ مارا۔ جس سے وہ شخص بے ہوش ہوگیا۔ اجیت سنگھ کو اپنے مُکے پر فخر ہوگیا اور جسے مُکہ لگا وہ تو بول نہ سکا۔ مگر اِتنا ضرور ہوا کہ ساتھ والا کُتا زور سے بھونکنے لگا۔ لگا کہ سخت اِحتجاج کر رہا ہو اور کِسی نے اِحتجاج نہ کیا۔ مگر لگا کہ درختوں کے پتّے حیران اور پریشان ہوگئے ہیں۔ اصل میں اجیت سنگھ کوئی بُرا آدمی نہیں تھا' مگر وہ یہ برداشت نہ کرسکتا تھا کہ کوئی اُس کی گاڑی روکے۔ کیونکہ کرکٹ کا پلییئر ہونے کے علاوہ کروڑوں کا مالک بھی تھا۔ ایک بڑا زمیندار بھی تھا اور بہت مشہور تھا۔ پریس اور میڈیا اُس کے پیچھے تھے۔ اُس کا مطلب اُس نے یہ لیا تھا کہ وہ جو چاہے کرے' جتنی مرضی تیز رفتار میں گاڑی چلائے کوئی اُسے روک نہ سکتا ہے' کوئی اُسے ٹوک نہ سکتا ہے۔

گردھاری کا بیٹا تیز رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا تو ساتھ والے دوست نے کہا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' اِس پر اُس نے کہا کوئی بات نہیں پتا جی ایس. پی. ہیں۔ اِس پر اُس کے دُوسرے دوست نے کہا۔'' ایس. پی ہیں اِس لئے گاڑی صحیح چلانی چاہیئے۔'' سب سوچ پر ہی منحصر ہے۔ سوچ اگر سیدھی ہوجائے تو زندگی سیدھی ہوجاتی

ہے۔تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شخص پرم جیت سنگھ مر گیا۔اجیت سنگھ بڑا پریشان ہوا۔اُس کو یہ صدمہ برداشت کرنا اپنے آپ میں مشکل لگا۔

ایک لمحے میں اُس نے مار دیا مگر لگتا تھا کہ اب سزا ایگوں کو بھوگنی پڑے گی۔ مگر فکر تھی کہ کہیں اُس کو سزا نہ ہو جائے۔ پولیس والوں کو اجیت سنگھ سے اپنی ہمدردی دِکھانے کا موقعہ ملا۔ پھر ایک دِن وہی ہوا۔ وکیلوں کی بحث ہوئی' دلائل ہوئے اور اجیت سنگھ بری ہو گیا۔

پرم جیت سنگھ کی چھوٹی بیٹی' بیوہ اور بہن وہاں پر کھڑے رہے۔یوں لگ رہا تھا کہ اصل مُلزم تو وہ ہیں اور یہ بھی لگ رہا تھا کہ اُنہیں سزا ہوگئی ہے۔وہ چُپ چاپ خاموشی سے دیکھتے رہے۔

''ہمارا کیا ہوگا....؟''

''ہمارا کیا ہونا ہے؟اگر اُس کو سزا بھی ہو جاتی تو ہمارا کیا ہونا تھا؟'' پرم جیت سنگھ کی بیوہ نے کہا۔

''میں کیا کروں؟ میرا بھائی تو مر گیا ہے۔یہ بحثیں' دلائل' پولیس تو اپنا کام کرتے ہیں اور ہمیں اپنا کام کرنا ہے یعنی کہ بے اِنصافی کا زہر ہر حال میں پینا ہے۔'' پرم جیت سنگھ کی بہن؛ گُر درشن کور نے جواب دیا۔

اجیت سنگھ نے محسوس کیا کہ یہ الگ بات ہے کہ جج کو ثبوت نہ ملے ہیں۔مگر ثبوت ہیں اور چاروں طرف سے پھیلے ہوئے ہیں۔وقت گُزرنے کے ساتھ پرم جیت سنگھ کے گھر کی حالت اور خراب ہوگئی۔اِدھر اجیت سنگھ نے محسوس کیا کہ پانی پینے میں اب اُسے مزا نہ آتا ہے۔وہ ہوا بھی کُھر دری محسوس کرتا ہے۔ پھر اُس نے سوچا اور ثبوت تو ہر طرف بکھرے پڑے ہیں مگر کوئی اِنہیں اکٹھا کرنے والا نہ ہے۔نہ جانے کیوں ایک دِن اجیت سنگھ کے قدم آہستہ آہستہ پرم جیت سنگھ کے گھر چلے گئے۔وہاں جا کر اُس نے پرم جیت کی بیوہ' اور اُس کے روتے ہوئے بچوں کو دیکھا۔اُس کے ماں

باپ کو دیکھا اور پھر اُس کی جوان بہن کو دیکھا اور دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اُس نے جاتے ہی کہا ''حکومت نے آپ کے لئے مدد دینے کا اعلان کر دیا ہے۔ ہر مہینے آپ کو دو ہزار روپے ملنا شروع ہو جائیں گے۔''

اُس کے بعد ہر مہینے دو ہزار روپوں کا منی آرڈر آنے لگا اور اس خاندان کا گزارا چلنے لگا۔ وہ بھوک اور غربت سے نجات پانے لگے۔ مگر اِس سے بھی وہ مطمئن نہ ہوا.......اجیت سنگھ رات بھر سو نہ سکتا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ کوئی اُس کے سر پر مُکے مار رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کیوں نہ جیل چلا جائے۔ شاید اس سے اُس کا دل ہلکا ہو جائے گا۔ اُس کے آگے تو ایک مستقبل ہے۔ اُسے عالمی سطح کا پلیئر بننا ہے۔ اور وہ دن یہ دن آگے بڑھ رہا ہے۔ اُس کے دل میں اجیت سنگھ کی بہن کی شکل مکمل طور پر بس گئی تھی۔ ہر وقت اُس کے سامنے اُس کا چہرہ گھومتا رہتا۔ اُسے لگا کہ وہ اُس کا پیچھا نہ چھوڑ رہی ہے۔

پھر اُس نے دیکھا کہ پرم جیت کی بہن حد سے زیادہ خوبصورت ہے۔ لمبی، پتلی، اور جب چلتی تو لگتا ہے کہ ہوا اُس کی مدد کر رہی ہو۔ اُس کا بھائی مہیش خوبصورت نوجوان تھا۔ اجیت سنگھ نے ایک دِن مہیش اور پرم جیت سنگھ کی بہن گُردرشن کو بُلایا۔ دونوں نے ایک دُوسرے کو پسند کیا اور اُن کی آپس میں شادی بھی ہو گئی۔

پھر ایک دن گُردرشن کے سامنے ایک قتل ہوا۔ مگر گردرشن نے صرف اِتنا کہا، قتل ہوتا ہے، کیس چلتا ہے، وکیل بحث کرتے ہیں اور مُلزم کو سزا ہونی ہے یا بری ہونا ہے۔ مگر اخباروں میں خبریں آتی ہیں اور بعد میں اُن گھر والوں پر کیا گزرتی ہے، یہ کوئی نہ جانتا ہے۔ اب گُردرشن کافی ہوشیار ہو گئی تھی۔ مگر اُسے اپنا بھائی پرم جیت سنگھ ہمیشہ یاد آتا۔ ایک دِن پھر کہنے لگی۔ کیا خبریں آرہی ہیں، قیدیوں کا سُدھار کرو، اصل میں انھیں سہولتیں فراہم کریں۔ مگر بدقسمتی سے........یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ مرنے والوں کے رشتہ داروں کا کیا ہوا۔ اُن کے بچوں کا کیا حال ہوا، اُن کی بیویوں کا کیا ہوا۔ اِس

بات پر کوئی بحث نہ تھی۔ آہستہ آہستہ اجیت سنگھ کو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔

اجیت سنگھ ایک سُپر سٹار بن گیا ہے۔ مگر پرم جیت کے کنبہ کو اُس سے از حد پیار تھا۔ ایسا کرنے سے اُسے لگتا تھا کہ اُسے چین مل رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پرم جیت سنگھ کے بچوں کو بھی اصلی بات معلوم ہو گئی تھی۔ مگر اجیت سنگھ نے اُنہیں از حد پیار دیا۔ سب کو لگا کہ پرم جیت کی رُوح کو چین مل گیا ہے۔ اِدھر اجیت سنگھ ہر روز گاؤں آتا تھا۔ سارا گاؤں اُس کا عاشق ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے پیسوں سے کرکٹ کا ایک گراؤنڈ گاؤں کے لئے بنوایا تھا۔ اُس نے گاؤں کی سڑکیں بھی پکی کروائیں تھیں۔ وہ اُس گاؤں کا ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ گاؤں کے سرپنچ نانک چند کی لڑکی کو بھی دیکھنے لگا۔ پھر...... دونوں کے درمیان آنکھوں کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ جب وہ آنکھیں ملاتے تو لگتا کہ ہوائیں اُن کے خط اِدھر اُدھر لے جا رہی ہوں۔ اُس کی محبت میں اجیت سنگھ شاعری بھی کرنے لگا تھا۔ لوگ پرم جیت کی موت کو ایک حادثہ سمجھنے لگے تھے حالانکہ وہ سمجھتے تھے کہ ایسا نہ ہے۔ مگر پھر بھی لوگ پرم جیت سنگھ کی موت کو بھگوان کی مرضی ضرور سمجھنے لگے تھے۔

نانک چند کی لڑکی کی شادی کی بھی تیاری ہونے لگی۔ اجیت سنگھ اُس گاؤں کا تقریباً بھگوان بن گیا تھا۔ خوب چرچا ہوا نانک چند کی لڑکی کانتا اور اجیت سنگھ کی محبت کا۔ اجیت سنگھ نے جب سے کانتا سے محبت کی ہے اُسے سرسوں کا ساگ کھانے میں بڑا مزا آنے لگا اور گھر کا مکھن اُس کی خواہش بن گیا۔ پھر گُردوارے جانے کا شوق بھی اُس کے دِل کے اندر پیدا ہونے لگا۔ اُسے لگتا کہ کانتا کا حُسن اُسے کھینچ کر یہاں لا رہا ہے۔ اُس کا دل اب اُونچے مکانوں میں نہ لگتا ہے۔ بے شمار لڑکیوں کو وہ دیکھتا ہے مگر اُسے صرف کانتا ہی پسند ہے۔ سرسوں کے کھیت وہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ اب گاؤں کے درخت بھی کسی کو نہ کاٹنے دیتا۔

اِدھر اجیت سنگھ کی رہائی کے خلاف پندرہ برس کے بعد ہائی کورٹ نے اپیل

کی سماعت شروع کر دی۔ لوگ حادثہ بھول چکے تھے۔ عدالت میں بحث ہوئی۔ سرکاری وکیل جو کہ اجیت سنگھ کا ہم جماعتی تھا اور اُس کی ترقی سے جلتا تھا' نے خوب بحث کی اور اُسے سزا دس سال کی قید ہو گئی۔ ججوں کا نام خوب اخباروں میں آیا۔ سارے گاؤں میں ماتم چھا گیا۔ لوگ رونے لگے۔ پرم جیت سنگھ کے گھر والے بھی۔ نانک چند نے بھی کہا کہ یہ کیسا اِنصاف ہے جس کا ہر وقت قتل ہوتا رہتا ہے۔

''جب اجیت سنگھ کو سزا ملنی چاہئے تھی' وہ بری ہو گیا اور جب بری ہونا چاہئے تھا' اُسے سزا مل گئی اور یہ سزا اب سارے گاؤں کو ملے گی۔ مجھے مِلے گی' اجیت سنگھ کو ملے گی۔'' نانک چند کی بیٹی کانتا نے کہا۔

پرم جیت سنگھ کی بیوی نے کہا ''جب اجیت سنگھ بری ہوا تھا' اُس وقت ہمارے ساتھ پہلی بے اِنصافی ہوئی تھی۔ آج اُسے سزا ہوئی' تو یہ ہمارے ساتھ دُوسری بےانصافی ہے۔''

***

سُنہری مچھلی

کام دیو کے نام کا مچھیرا سمندر کے کنارے رہتا تھا اور مچھلیاں پکڑتا تھا۔ جال پھینکتا ہے اور سمندر سے مچھلیاں نکال لیتا ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے مچھلیوں پر اُس کا بچپن کا حق ہو۔ مچھلیاں بھی اُس سے آنکھ مچولی کھیلتیں۔ کبھی اِدھر سے گُزرتیں کبھی اُدھر سے۔ مچھلیاں ہی کام دیو کی روٹی روزی ہیں۔ اُس نے ایک دِن ایک سُنہری مچھلی جال میں پھنسائی.........

''سنہری مچھلی........سونے کی مچھلی......'' شور مچ گیا۔

کام دیو کے کنبے کے سارے لوگ آ گئے مگر ایک انہونی ہو گئی۔ جال نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ جہاں سے پھٹا ہوا تھا وہاں سے اور زیادہ پھٹ گیا۔ مچھلی جال سے نکلی اور دُوسری طرف چلی گئی۔ کام دیو نے فوراً چھلانگ لگائی۔ مچھلی کے پیچھے بھاگا۔ مچھلی تو اِدھر سے اُدھر چلی گئی لیکن کام دیو پکڑا گیا۔ سمندر کی فوج نے کام دیو کو پکڑ لیا۔

''صاحب میں سمندر میں مچھلی پکڑ رہا تھا۔''

''یہ ہمارا سمندر ہے۔'' کیپٹن نے کہا۔

''صاحب سمندر سمندر ہے۔ یہ کسی کا نہ ہو سکتا ہے اور میرے دادا تو کہتے تھے کہ سمندر زمین کے ساتھ وجود میں آیا ہے۔ اور آدمی تو بعد میں آیا ہے۔'' کیپٹن کو غصہ بھی آیا اور حیران بھی ہوا۔ اُسے لگا کہ سمندر اُن تمام لوگوں کا ہے جو اِس کے کنارے رہتے ہیں۔

''تُم مچھلیاں کیوں پکڑتے ہو.....؟''

''صاحب، ہم اگر مچھلیاں پکڑتے ہیں تو بُرا کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ سمندر سونامی لاتا ہے اور ہمارے بچے مرتے ہیں۔ ہمارے گھر اُجڑتے ہیں۔ یہ ہماری اور سمندر کی بات ہے۔ آپ بیچ میں کیوں آتے ہیں۔ اور پھر اگر ہم مچھلیاں پکڑتے ہیں تو سمندر کو اُس کی قیمت دیتے ہیں۔''

''تُم اِس طرف کیوں آتے ہو....؟''

''صاحب میری مچھلی اِدھر آ گئی تھی۔ اُسے پکڑنے کے لئے آیا تھا۔''

''تم نے مچھلی کو پکڑنے کی کوشش کیوں نہ کی.....؟''

''صاحب بدقسمتی سے مچھلیاں اِنسان کی زبان کو نہ سمجھتی ہیں۔ اِس لئے اُنھیں معلوم ہی نہ ہے کہ انسان نے سمندر کو ہی بانٹا ہے۔''

''مگر یہ مچھلی تمہاری کیسے ہوئی.....؟''

''صاحب یہ میرے جال میں آئی ہے۔ جس کے جال میں آئی اُسی کی ہوئی ہے۔ یہ سمندر کا قانون ہے۔''

''مگر تم نے سرحد پار کی ہے......جو جُرم ہے۔''

''مچھلیوں کی سرحد نہ ہے اور نہ ہی مجھے معلوم ہے کہ پانی میں سرحد کیا ہوتی ہے۔ مُجھے وہی معلوم ہے جو سمندر میں مچھلی کو معلوم ہے۔'' کیپٹن کچھ پریشان ہوا مگر حولدار نے اُسے بچاتے ہوئے کہا۔ ''صاحب چلو اِس کو بڑے صاحب کے پاس پیش کرتے ہیں۔'' وہ سیدھا اُسے اپنی یونٹ کے کرنل کے پاس لے کر گئے اور کہنے لگے۔

''صاحب' یہ بارڈر کراس کر کے آیا ہے۔''

''دیکھو اس کی جیب میں کیا ہے اور اس کی تلاشی بھی لو۔'' تلاشی کرنے پر اُس کی دونوں جیبوں سے کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ کرنل نے کیپٹن اور حوالدار سے کہا۔

''اِسے میرے پاس رہنے دو۔ ابھی کاغذوں میں اِس کی گرفتاری نہ ڈالنا۔''

''صاحب قید تو میں اِنسانوں میں ہوں۔ کیا کاغذوں میں ایسا کرنے سے میں کاغذوں میں قید ہو جاؤں گا....؟'' مچھیرے نے پوچھا۔

''زیادہ باتیں مت کر اور میرے پاؤں دبا۔'' یہ سُن کر کام دیو مچھیرا کرنل کے پاؤں دبانے لگا۔

''گھر میں کون ہے؟''

''صاحب بیوی ہے۔''

''کیسی ہے......؟''

''جناب جیسی بھی ہے' سرحد کے اُس پار ہے۔ اور کیا معلوم میرے یہاں ہوتے ہی کوئی......اُس کا بلاتکار کر دے۔''

''مگر وہ تو تمہارے مُلک کی فوج ہے۔''

''صاحب کیا آپ کے مُلک کے فوجی یہاں کی عورتوں کے ساتھ بلاتکار نہیں کرتے.....؟'' اِس پر کرنل پریشان ہو گیا۔ وہ ابھی پاؤں دبوا ہی رہا تھا کہ ایک کیپٹن وہاں پر آ گیا۔ اُسے دیکھتے ہی کرنل نے کہا۔ ''کچھ دیر کام کروا کر اِسے واپس بھیج دیتے ہیں۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔ کوئی نہ کوئی مچھیرا ضرور اِدھر سے اُدھر جائے گا کیونکہ سمندر کی لہریں نہ سرحدوں کو مانتی ہیں اور نہ فوج کو۔'' مچھیرے نے کہا ''صاحب آگ ایک طرف لگ جائے تو دُوسری طرف کے لوگوں کو بھی بُجھانی چاہئے کیونکہ آگ اور پانی کی کوئی سرحد نہ ہے جی۔''

''یہ تم نے کہاں پڑھا ہے.....؟''

''صاحب سمندر میں رہتے ہیں، پانی کے مزاج کو جانتے ہیں۔ اور آگ کے مزاج کو بھی سمجھتے ہیں۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔ اسے یہیں رہنے دیتے ہیں۔'' کرنل نے کہا۔

''ایسا کرنا بڑا ضروری ہے.......''

''صاحب ہم نے ابھی کرنل صاحب کو بھی واپس لے آنا ہے......''

''کون کرنل صاحب؟''

''صاحب وہی..... جو سرحد پار والی کو دِل دے بیٹھے تھے اور وہاں جاتے ہی پکڑے گئے تھے۔ بس ایک دو جوتے کھانے کے بعد ہی پریشان ہو گئے اور دِل کی بیماری کو بھول کر جسم کی بیماری کے بارے میں سوچنے لگے...... صاحب ایک بات اور بھی ہو گئی ہے۔''

''وہ کیا.....؟'' کرنل نے پوچھا۔

''صاحب کل صبح ہماری ایک خوبصورت عورت اُدھر چلی گئی ہے۔ مگر بدقسمتی سے جو عورت اُدھر سے اِدھر آئی ہے وہ خوبصورت نہ ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ بالکل ہی کالی ہے اور پھر یقیناً وہ لوگ تو مزا لے رہے ہوں گے اور ہم اِدھر بالکل بے مزا ہو گئے ہیں۔'' حوالدار نے کرنل سے کہا۔

''ایسا کرو کہ اِسے ریڈ کراس والوں کو دے دو۔''

''کیوں......'' کیپٹن نے پوچھا۔

''بھائی یہ بارڈر ہے۔ یہاں پر سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے' اور کل ہی مجھے ایک ریڈ کراس کا آفیسر کہہ رہا تھا کہ ایک دو دِن کے اندر اگر کوئی نیا معاملہ نہ آیا تو اُن کا دفتر بھی بند ہونے کا خطرہ ہے۔'' وہ مچھیرا پاؤں ہی دبا رہا تھا کہ ایک دُوسرے آفیسر نے کہا۔ ''صاحب بارڈر پر بڑا مزا ہے۔ تنخواہ زیادہ ملتی ہے اور کام کم کرنا پڑتا ہے اور

سچائی یہ ہے کہ ہماری اور پار والوں کی وردیاں الگ ہیں.....ملک الگ ہیں.....مگر مسئلے ایک جیسے ہی ہیں۔"

"ایک بات سمجھ نہیں آئی..." مچھیرے نے پاؤں ذرا زور سے دباتے ہوئے کہا"....درخت تو سب موسموں میں ایک جیسے پھل دیتے ہیں اور پانی کا مزا بھی تو زمین کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ زمین تو آگے بٹی رہتی ہے.......موسموں میں' سمندروں میں' پہاڑوں میں' ہمیں سرحدیں بنانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟"

"زیادہ باتیں مت کر..... ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے......؟" کیپٹن نے پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"صاحب وہ کہتے ہیں کہ چونکہ وہ عورت خوبصورت ہے لہٰذا دو عورتوں کے عوض وہ اُس کو چھوڑ دیں گے۔" کرنل یہ سُن کر حیران ہو گیا۔ اُس نے پھر مچھیرے کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"اُس سنہری مچھلی میں ایسی کیا بات تھی....؟"

"صاحب وہ از حد خوبصورت تھی۔ کئی رنگوں کی بنی ہوئی تھی۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُس کو گھر میں رکھنے سے اِنسان کی قسمت ہی بدل جاتی ہے۔ ہر خواہش پوری ہو جاتی ہے۔"

"تم پہچانتے کیسے ہو.....؟"

"صاحب سمندر سے ہمارا تعلق ہے اور کئی نسلوں سے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اور ہم تو اب مچھلیوں کو پکڑتے ہی نہیں بلکہ اُنہیں پہچانتے بھی ہیں' اِس لئے صاحب یہ سب کچھ ہے۔"

اِس پر کرنل کی نیت بدل گئی۔ اُس نے کہا۔ "یہ مچھلی پکڑ کر مجھے دے دو۔"

"ٹھیک ہے صاحب' میں ایسا ہی کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر مچھیرا بھاگا اور مچھلی کے پاس جانے لگا مگر جوں ہی اُس نے پکڑنے

کی کوشش کی وہ سرحد کے دُوسری طرف چلی گئی۔ مچھیرا اُس کے پیچھے گیا اور اُس نے مچھلی پکڑی۔ کرنل نے کہا ''کمال کر دیا ہے۔''

''مگر صاحب یہ تو سرحد کے اُس طرف ہے' اب آپ کچھ نہ کر سکتے ہیں۔''

مچھیرے کے گھر میں خوشی چھا گئی۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا کہ سب گاؤں والے خوش ہوئے کیونکہ وہ قسمت والی مچھلی مچھیرے نے پکڑی تھی۔ لگتا تھا کہ اب سب کی تقدیر بدل جائے گی۔ گاؤں میں جشن ہوا۔ آگ کے اِرد گرد خوبصورت لڑکے لڑکیاں خوشی سے ناچنے لگے۔ سب کے دِل میں ایک ہی بات تھی۔ وہ اِس بات سے خوش تھے کہ اُن کی مرادیں مان لی جائیں گی مگر دُوسرے ہی لمحے میں اِدھر کے کرنل نے کہا۔

''رپورٹ آئی ہے کہ یہ مچھلی اُدھر کی ہے۔ ہمیں واپس کرنی ہے۔''

''نہیں صاحب یہ مچھلی اِدھر کی ہے.....''

''وہ کرنل صاحب جھوٹ نہیں بولتے۔''

''صاحب آپ ہماری طرف کے کرنل ہیں۔''

کرنل نے مچھلی لی اور اپنی بیرک میں چلا گیا۔ اُدھر کے کرنل نے کہا۔ ''سُنہری مچھلی کرنل کے پاس ہی رہے گی' چاہے وہ اِدھر کا کرنل ہو یا اُدھر کا۔''

***

تھوڑی سی غلطی

پورن نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''بڑا اچھا تھا میرا بیٹا۔ صبح اُٹھتا' پہلے خود نہاتا پھر میرے نہانے کے لئے پانی گرم کرتا اور بازار سے سامان لاتا۔ کھیتوں میں تھوڑا بہت کام کرنے کے بعد اسکول جاتا۔''

پورن کی بات سُن کر چونی آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا اُسے کہہ رہا ہو کہ تیری قسمت میں کچھ کرنا بھی ہے یا دیکھنا ہی ہے۔ اِتنا بڑا ہونے کا کیا فائدہ اگر ایک واقعے کو بھی نہ روک سکتا ہو۔ جب چندو کی بیٹی بریتا کا بلاتکار ہوا تب بھی تُو خاموش رہا' جب گوبند کے اِکلوتے بیٹے کا قتل ہوا تب بھی تُو خاموش رہا۔ اور سب کچھ یوں دیکھتا رہا جیسے ہماری بے بسی کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ چونی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو.......؟''

''میں کہنا نہیں' سننا چاہتا ہوں۔''

''تو سناؤ۔'' چونی نے کہا۔

''بڑا اچھا تھا راجہ۔ ایک بار میں نے سوچا کہ کاش یہ سچ مچ کا راجہ ہوتا۔ مگر

دوسرے ہی لمحے میں میری سوچ نے مجھے جھنجھوڑا اور کہنے لگی کہ کیا سوچ رہے ہو؟ اگر اصلی راجہ ہوتا تو کسی صورت تمہارا بیٹا نہ ہوتا اور پھر میں اُس دن اس حقیقت کو سمجھ گیا کہ غریب لوگوں کو نام تک ہی اپنے آپ کو مطمئن رکھنا چاہئے۔ جیسے چھوٹے سے کمرے کا نام محل رکھ لو۔ اپنی بیٹی کا نام رانی رکھ لو۔ اگر امیر کا بیٹا آفیسر بن جائے تو اپنے بیٹے کا نام آفیسر سنگھ رکھ لو۔''

اُن دونوں کی آنکھیں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ گویا اُس سے مخاطب ہو کر کہہ رہی ہوں کہ آخر تُو کیوں ہماری مدد نہیں کرتا۔ پھر تھوڑی سی ہوا چلی۔ اُنہیں محسوس ہوا کہ جیسے آسمان کہہ رہا ہو میں نیچے اِس لئے نہیں آسکتا کیونکہ زمین چھوٹی ہے۔ میں بہت بڑا ہوں' میرے بوجھ سے دب جائے گی یہ زمین۔ مگر ہوا نے اِس بار پھر یوں چلنے کی کوشش کی گویا کہہ رہی ہو' جھوٹ بولتا ہے کیونکہ آسمان کا کوئی وزن نہیں ہے اور نہ ہی اُس کا کوئی وجود ہے اور نیچے اِس لئے نہیں آتا کیونکہ اِس سے اُس کا یہ راز عیاں ہو جائے گا اور لوگ اُس سے ڈرنا چھوڑ دیں گے۔

اُس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ راجہ صرف ایک روپیہ لیتا کرائے کے لئے اور اسکول میں بھوکا رہتا۔ نہ جانے کیا ہوا۔ ایک دن وہ کھیتوں میں گیا اور پرانے سائیکلوں کے دو ٹائر کہیں سے اُٹھا لایا۔ پھر اپنے ایک دوست سے مانگ کر ہینڈل لایا اور کباڑی کے پھینکے ہوئے سامان سے سائیکل کا ایک جسم لے آیا اور پھر سارا دِن بیٹھ کر کام کرتا رہا اور اُس نے سب ملا کر ایک سائیکل تیار کیا اور شور مچا دیا اور زور زور سے کہنے لگا۔

''میں نے کمال کر دیا ہے۔''

یوں لگا کہ جیسے پہاڑ سے دُودھ کی نہر نکال کر لایا ہو یا زمین چاند کو روشنی دے رہی ہو۔ سانس پھول گئی۔ اُس کو لگا کہ جیسے اُس نے کوئی نئی چیز ایجاد کی ہو۔ میرا ایک روپیہ بچ جائے گا۔ میرے ماں باپ کے سر سے کچھ بوجھ تو کم ہو جائے گا۔ اُس روز وہ

خوب ناچا، نہایا بھی خوب، بہت پانی ڈالا اُس نے اپنے جسم کے اُوپر، کئی لوٹے ڈالے۔ ناشتے میں اُس نے چھ روٹیاں کھا ڈالیں۔ اِتنا خوش تھا وہ۔ پھر اچانک ہی پریشان ہوگیا۔ کیونکہ اِس کے بعد اُسے یہ معلوم ہوگیا کہ آج میں دو روٹیاں کم کھاؤں گا۔" پورن نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کہانی میں سُنا رہا ہوں مگر آنسو تمہاری آنکھوں میں کیوں ہیں؟"

"درد کی کہانیاں ایک دُوسرے کو جوڑتی ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ایک کا رونا دُوسرے کی آنکھیں روئیں۔" لگا کہ چونی ایک ان پڑھ آدمی نہ ہو بلکہ فلسفے کا پروفیسر ہو۔

"تو تم بھی اپنی کہانی سناؤ۔"

دُور ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ گویا کہہ رہا ہو یہاں پر کوئی کسی کی کہانی پر نہیں روتا کیونکہ ہر شخص کی اپنی کہانی ہے۔ دُوسرے کی کہانی سُن کر اصل میں اُسے اپنی کہانی یاد آجاتی ہے۔

"تم سناؤ۔ آج میں سننے کے لیے تیار ہوں۔"

اور پرندے چہچہائے۔ گویا کہہ رہے ہوں اگر ہم ایک دُوسرے کی کہانیاں سُن لیں تو یقیناً ایک دُوسرے کے دُکھ درد بانٹنے کے قابل بھی ہوجائیں گے۔ ابھی وہ باتوں میں مشغول ہی تھے کہ ایک گاڑی وہاں سے گزری اور چونی اُس کے پیچھے بھاگا۔

"پکڑو..... پکڑو........." مگر گاڑی کافی آگے نکل گئی۔

"کیوں......؟ کیا پکڑنا چاہتے ہو تم؟" پورن نے اُس سے پوچھا۔

"میری ٹانگ توڑ کر بھاگ گئی ہے۔"

اصل میں چونی کی ٹانگ بھی کسی کی ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ ایک سیٹھ کا لڑکا گاڑی چلا رہا تھا کہ اچانک ایک خوب صورت لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ آگے چونی جا رہا تھا۔ پیچھے سے چونی کی ٹانگ پر گاڑی چڑھ گئی اور اُس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اب چونی گاؤں کے چوراہے پر بیٹھ کر باتیں کرتا ہے۔ کبھی امن، کبھی مہنگائی تو

کبھی الیکشن کی۔ کبھی گاڑی کے پیچھے بھاگتا ہے تو کبھی گاڑیاں چلانے والوں کو گالیاں دیتا اور آسمان کی طرف دیکھ کر بھگوان سے شکوہ بھی کرتا۔ ''اگر تم نے امیروں کو اتنی مضبوط گاڑیاں دی ہیں تو کم از کم غریبوں کو مضبوط ٹانگیں ہی دیتا۔''

پھر چونی کے ساتھ ایک دُوسرا واقعہ بھی ہوا تھا۔ اُس کے لڑکے کو معمولی سی چوٹ سر میں لگ گئی تھی۔ اُسے ہسپتال لے جایا گیا تھا مگر ڈاکٹر نے اُسے بے ہوش کرنے والی دوائی زیادہ دی تھی اور اُس کی ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے اُس کا لڑکا مر گیا تھا۔ اور سچائی یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر ایک منتری کی چھوٹی سی مہربانی کی وجہ سے بنا تھا۔

ہوا یہ کہ اُس باپ نے الیکشن میں لاکھوں روپیہ خرچ کیا تھا اور جس پر کئے تھے وہ منتری بن گیا تھا اور اُسے ایک دِن مذاق میں کہا تھا کہ اُس کے لڑکے کو ڈاکٹر بننے کے بعد لڑکیوں کی چھاتیوں کو ٹٹولنے میں مزا آئے گا۔ اِس بات پر اُس منتری نے تھوڑی سی مہربانی کر کے اُسے ڈاکٹر بنوا دیا تھا۔

پہلے کالج میں داخلہ دِلوایا اور آہستہ آہستہ اُس نے ڈاکٹر کی ڈگری لے لی تھی۔

''تو تم اپنے لڑکے کی بات کر رہے تھے۔'' چونی نے پورن سے کہا۔

''ہوا یہ کہ اسکول کے سامنے ایک اور اسکول تھا۔ جہاں امیروں کے لڑکے و لڑکیاں پڑھا کرتی تھیں۔''

پورن یہ بات کہہ کر چپ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ مگر سوچتا ہی گیا۔ اُسے خیال آیا کہ عِلم تو بھگوان کی دین ہے۔ پھر یہ اسکول الگ الگ کیوں ہیں۔ سب کے جسم بھی برابر ہیں، سب ننگے پیدا ہوتے ہیں، کھیتی ایک ہی طریقے سے کرتے ہیں اور پھر یہ فرق کیوں ہے اور کپڑے جسموں کو کیوں بانٹتے ہیں۔ پورن یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دم اُسے چونی نے چونکا دیا۔

''تم کچھ کہہ رہے تھے۔''

پورن نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ راجہ کے سامنے والی لڑکیاں آدھی چھٹی

کے وقت آئس کریم کھانے کے لئے اپنے اسکول سے باہر آیا کرتی تھیں۔ راجہ بھی وہاں پر جانا شروع ہو گیا تھا اور ترنّم نام کی لڑکی کے ساتھ کھڑا ہو جاتا۔ ساتھ کے تمام لڑکے بھی کھڑے ہو جاتے۔ سب وہاں ایک دُوسرے سے باتیں کرتے۔

راجہ میں ایک خوبی اور بھی تھی کہ وہ جو کپڑا پہنتا اُسے اچھا لگتا۔ ایک دِن اُس کی قمیض بازو سے پھٹ گئی اور اُس کا بدن دِکھائی دے رہا تھا، تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چاند بادلوں سے جھانک رہا ہو۔ راجہ غریب تھا مگر سولہ برس کا ہو گیا تھا۔ اِس برس کی خواہش ذات پات، مذہب، ملک اور امیری غریبی کی غلام نہیں ہوتی۔ وہ آدھی چھٹی کے وقت وہاں کھڑا ہو جاتا اور لڑکیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر آئس کریم کھاتے ہوئے ترنّم کو دیکھتا۔

سولہویں برس کی خواہشیں بھی آگے بڑھیں۔ ایک دِن راجہ کے دِل کے اندر ایک نئی خواہش اُبھری کہ وہ ترنّم کو آئس کریم کھلائے۔ سوچتا گیا مگر پھر خوش ہو گیا۔ کیونکہ اُسے یاد آیا کہ اب وہ سائیکل پر اسکول آ جا سکتا ہے اور اِس طریقے سے بچے ہوئے ایک روپے سے ترنّم کو آئس کریم کھلائے گا۔

جیسے غریب کے گھر کبھی اچھی دال نہیں بن سکتی اُسی طریقے سے راجہ کبھی سیدھی سائیکل نہ چلا سکتا تھا۔ غریب کی دال میں کبھی مرچ کم ہو جاتی ہے تو کبھی نمک زیادہ ہو جاتا ہے۔ جس دِن ہلدی خرید کر لاتا ہے اُسی دِن تیل ختم ہوا ہوتا ہے۔ کبھی نمک کی کمی پوری کرنے کے لئے مرچ زیادہ ڈالتا ہے اور کبھی ہلدی کی کمی پوری کرنے کے لئے مسالہ زیادہ ڈالتا ہے کیونکہ بیس روپوں میں سارا سامان خریدنا ہوتا ہے۔ کبھی دُکاندار چیزیں کم یا زیادہ دیتا ہے یا وہ بھی کم یا زیادہ خرید لیتا ہے۔ راجہ کی سائیکل بھی غریب کی دال کی طرح ہی چلتی تھی۔ کبھی پیڈل چلانے کی کوشش کرتا تو کبھی پہیہ اپنی رفتار کم کر دیتا، کبھی بریک لگاؤ تو سائیکل اور تیز ہو جاتی۔ کبھی پہیے چلتے اور پیڈل رُک جاتا۔ کبھی اُس کے اُلٹ ہوتا۔

پورن نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا......

''پھر ایک دِن ترنّم کے باپ نے اُس کے لئے نئی گاڑی خریدی تھی اور اُسے ترنّم چلا رہی تھی۔ گاڑی دیکھ کر راجہ نے سائیکل روکنے کی کوشش کی مگر وہ زیادہ تیز ہوگئی۔ وہ گاڑی سے ٹکرا گئی۔ راجہ خوش ہوا۔ چلو وہ نہ سہی سائیکل تو ترنّم سے ٹکرائی۔ مگر دُوسرے ہی لمحے میں راجہ گر گیا اور مر گیا۔ ترنّم کے باپ نے صرف اِتنا ہی کہا کہ تھوڑی سی غلطی اُس کی بیٹی کی بھی ہے۔

***

حساب، جیومیٹری

نیرو کی آنکھیں جوں ہی کرشن کی آنکھوں سے ٹکرائیں اُس کے ہاتھوں کے اندر ایک عجیب سی حرارت شروع ہوگئی اور یہ ہی حرارت یہاں کرشن کے پاؤں کے اندر بھی آگئی۔

دونوں پڑوسی تھے اور پھر کرشن کے گھر اُس کا باپ گُٹھے کے پھول اُگاتا تھا جو کہ نیرو کو پسند تھے اور نیرو کی ماں اپنے گھر گلاب کے پھول اُگاتی تھی جو کہ کرشن کو پسند تھے۔ یہ بھی ایک عجیب اِتفاق تھا کہ نیرو کا باپ مرگیا تھا بچپن میں اور کرشن کی ماں مرگئی تھی اُس کے بچپن میں۔ باپ کا پیار حاصل کرنے کے لیے نیرو کرشن کے گھر جاتی اور کرشن ماں کا پیار حاصل کرنے کے لیے نیرو کے گھر جاتا۔ کرشن سادے کپڑے پہنتا اور اُس کی اِسی سادگی پر نیرو مرمٹی تھی اور نیرو کی دِل کش اداؤں پر کرشن۔ وہ دونوں پھر ایک ہی سکول میں داخل ہوگئے۔ صبح تیار ہو کر جاتے۔ کرشن کو بند گوبھی پسند تھی' اِس لیے وہ اپنے کھانے میں بند گوبھی لاتی اور نیرو کو پھول گوبھی۔ اِس لیے کرشن اپنے لنچ میں پھول گوبھی ضرور لاتا تھا۔

یہ سلسلہ در سلسلہ قائم رہا۔ وقت آگے بیتتا رہا۔ دونوں جماعتیں چڑھتے گئے۔

مگر نہ جانے کیوں ایک بات اُلٹ ہوگئی کہ کرشن کے باپ کو اپنے کاروبار میں گھاٹا پڑ گیا مگر نیرو کا باپ اُس کی پڑھائی کے لیے کافی پیسہ چھوڑ گیا تھا۔ اور نیرو کو حساب نہ آتا تھا مگر کرشن حساب میں ماہر تھا اور نیرو کو حساب کے سوال سمجھاتا تھا۔ نیرو کو جیومیٹری پر مہارت حاصل تھی اور کرشن کو جیومیٹری نہیں آتی تھی۔ نیرو کرشن کو جیومیٹری کے سوال سمجھاتی تھی۔ کرشن کو تاریخ پر مہارت حاصل تھی اور وہ نیرو کو تاریخ پڑھاتا تھا۔ اور نیرو کو جغرافیہ پر مہارت حاصل تھی اور وہ کرشن کو جغرافیہ پڑھاتی تھی۔ اِس طریقے سے یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ وہ دونوں ایک دُوسرے کے سامنے رہتے تھے، مگر ایک سیدھی سڑک پر اپنے اپنے بستوں کو اُٹھائے سکول جاتے تھے۔ وہ کچھ نہ کچھ لفظوں کے معنی ایک دُوسرے سے پوچھتے تھے اور ایک دُوسرے کو دیکھتے رہتے تھے۔

کرشن سالانہ اِمتحان میں جان بوجھ کر کچھ سوال غلط کرتا تاکہ نیرو جماعت میں اوّل آئے۔ اِس بات پر سب حیران تھے۔ کرشن اور حساب کا سوال غلط کرے۔ کرشن اور تاریخ کے سوال کا جواب غلط دے۔ لوگوں کو کسی بھی طریقے سے یہ بات ہضم نہیں ہوتی تھی اور اِس برس کرشن نے اپنے آنگن میں خوب گھٹے لگائے۔ سب حیران تھے کہ صرف گھٹے کے پھول ہی کیوں۔ مگر محبت کے کئی رنگ ہیں جو موسموں کے ساتھ کئی خوشیاں لاتے ہیں، نئے ولولے لاتے ہیں۔ لوگ اپنے دِلوں میں یہ بات محسوس کرتے تھے مگر کہتے نہ تھے۔

بارھویں کا نتیجہ نکلا تو نیرو اوّل آئی اور کرشن پاس ہوگیا۔ نیرو کو شہر میں ڈاکٹری کی سیٹ مل گئی۔ کرشن خوش تھا کہ چلو نیرو ڈاکٹر بن جائے گی مگر کرشن آگے نہ پڑھ سکا۔ کرشن ہمیشہ نیرو کو یاد کرتا۔ دریا کے کنارے جاکر ریت پر نیرو کی تصویر بناتا اور بناتا ہی جاتا۔ ایک دِن کرشن نیرو کو دیکھنے کے لیے شہر میں اُس کے کالج میں گیا۔ وہاں نیرو اپنے ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ بیڈمینٹن کھیل رہی تھی۔ اُس نے نکر پہنی ہوئی تھی۔ کرشن کو سمجھ آگئی کہ اُس کے اور نیرو کے درمیان اب بہت کم چیزیں مشترکہ رہ گئی ہیں۔

مگر نہ جانے کیوں کرشن کے دِل کے اندر نیرو کو چاہنے کی آرزو کبھی ختم نہیں ہوئی۔ وہ دِن رات اُسے چاہنے کے بارے میں سوچتا رہتا اور سوچتا ہی گیا۔

وہ گاؤں کی چوپال میں بیٹھ کر نیرو کی باتیں کرتا اور کرتا ہی جاتا۔ وہ روز کہتا۔

''کمال ہو جائے گا' گاؤں کی لڑکی ڈاکٹر بنے گی۔ اب گاؤں میں سارا علاج ہو گا۔'' لوگ حیرانگی سے اُس کی طرف دیکھتے۔ وہ پھر کہتا۔

''وہ بہت اچھی ڈاکٹر ہوگی۔''

پھر وہ کہتا کہ وہ اس وقت پڑھ رہی ہے۔ وہ نیرو کے متعلق باتیں کرتا اور خوشی محسوس کرتا اور خوش ہوتا رہتا۔ کوئی بیمار ہوتا تو وہ سیدھا اُس کے گھر جاتا اور کہتا۔ ''گھبراؤ مت۔ نیرو جلد ہی ڈاکٹر بن جائے گی۔'' اُس کی باتیں سُن کر یوں محسوس ہوتا کہ وہ چاہتا ہے کہ جب تک نیرو ڈاکٹر بن کر نہیں آتی یہاں کے ہر آدمی کو بیمار رہنا چاہئے۔

اب نیرو گاؤں آتی لیکن صرف ایک یا دو گھنٹوں کے لیے۔ اُس کی ماں کالج ہی میں اُس سے ملنے کے لیے چلی جاتی۔ کرشن کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اب نیرو کاغذ کے پھول پسند کرنے لگی ہے۔ اب کرشن نے سوچا کہ وہ کیا کرے۔ اُسے شراب کی عادت پڑ گئی۔ وہ دِن رات شراب پینے لگا۔ ایک دِن گاؤں کے ایک شخص نے اُس سے کہا۔

''ہر وقت مت پیا کر' بیمار ہو جائے گا۔''

''میں بیمار ہو جاؤں گا تو نیرو میرا علاج کرے گی۔'' وہ خوش ہوا۔

اُس نے محسوس کر لیا کہ نیرو سے ملنے کا اب یہی ایک طریقہ ہے۔ وہ اور شراب پینے لگا۔ یہاں تک کہ از حد بیمار ہو گیا مگر شراب کی عادت مضبوط ہوتی رہی اور بیماری آگے بڑھتی گئی۔ اِدھر اور عرصہ بیتا۔ نیرو ڈاکٹری کر کے ساتھ کے ہسپتال میں تعینات ہو گئی۔ کرشن بہت خوش ہوا مگر شراب اُس نے اور زیادہ کر دی۔ اب وہ صبح و شام اور دِن رات پینے لگا تھا۔ اب وہ مندر جا کر بھگوان سے دُعا کرنے لگا کہ اے بھگوان مجھے درد دے' مجھے بیماری دے اور یہ بیماری قائم رکھتا کہ نیرو میرا علاج کر سکے۔

اُسے لگا کہ اُس کی زِندگی ایک ریت کا پہاڑ ہے جس کے ذرّے ذرّے میں بس نیرو ہی بسی ہوئی ہے۔ مگر وقت کی ہوا کا جب دِل چاہے گا اُس پہاڑ کو بکھیر دے گی۔ وہ اب ریت کے اِس پہاڑ کی مضبوطی کے لیے دُعائیں کرنے لگا' یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ممکن نہیں ہے۔

وہ سوچتا تھا کہ نیرو ایک دِن گاؤں میں آئے گی۔ اُسے معلوم ہوگا کہ کرشن از حد بیمار ہے۔ وہ خوب تڑپے گی' روئے گی اور پھر اُس کا علاج کرے گی۔ مگر یہ نہ ہو سکا۔ ایک دِن وہ سخت بیمار ہو گیا۔ گاؤں کے لوگ اُسے ہسپتال میں لے گئے۔ وہ خوش ہو گیا کیونکہ اُس نے سوچا اُس کی آنکھوں کو نیرو کا چہرہ دیکھنے کو ملے گا۔ اُس کے کان نیرو کی آواز سُنیں گے۔ اُس نے تاریخ جغرافیہ حساب و جیومیٹری کا ملن یاد کیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ یہ ملن کا سفر ڈاکٹر اور مریض تک پہنچا ہے۔

اُس نے دِل ہی دِل میں سوچا کہ جب نیرو کے ہاتھ اُس کے بدن کو چھوئیں گے تو اُسے لگے گا کہ وہ تیرتھ کر رہا ہے۔ خوشی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُسے اپنی بیماری سب سے اچھی لگی۔ اُسے یہ بھی یاد آیا کہ نیرو فسٹ آئے اِس لیے وہ اپنے حساب کا سوال غلط کیا کرتا تھا۔ مگر دُوسرے ہی لمحے اُسے سب کچھ ٹوٹتا ہوا نظر آیا کیونکہ اُسے ایک دُوسرے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا جہاں اُسے معلوم ہوا کہ نیرو ہڈیوں کی ڈاکٹر ہے اور اُسے پیٹ کی بیماری ہے۔

***

ایک داغ

شیلا اور راجہ کے درمیان از حد پیار تھا۔ وہ دِل و جان سے ایک دُوسرے کو چاہتے تھے۔ وہ پیار، جو کہ گلیوں سے شروع ہو کر سکول اور پھر کالج تک پہنچا۔ پیار اور آگے بڑھا اور بڑا ہوا۔ رِشتوں میں بدلنے لگا اور ایک دِن اُن دونوں کی شادی ہو گئی اور پہلی رات کی تیاری بھی۔ سلسلہ اور آگے بڑھا۔ رات اُس روز کافی کالی تھی اور دُلہن کی سیج بھی سجی ہوئی تھی۔ راجہ آیا اور سیدھا شیلا کے بستر پر چلا گیا۔ مگر پھر اُسے یاد آیا کہ آج سے لے کر وہ بستر اُن کا ہے۔ مگر دُوسرے ہی لمحے میں اُس کی ساری خوشی غم میں بدل گئی، جب اُس نے دیکھا کہ اُس کی بیوی کے ران پر ایک سفید داغ ہے۔ وہ بھاگ گیا کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ یہ سفید داغ اُس کی بیوی کے سارے بدن پر پھیل جائے گا اور اُس کی ساری زِندگی جہنم بن جائے گی۔ اُس نے اپنے گھر والوں کو یہ ساری بات سُنا ڈالی۔ سارے گھر کے اندر ہنگامہ ہو گیا۔ اب کیا کِیا جائے، اب کیا ہو گا؟ سبھی اِن سوالوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔

راجہ ایک اچھا لڑکا تھا مگر سچائی یہ بھی ہے کہ بہت اچھا نہ تھا۔ وہ ایک عام آدمی

کی زِندگی جینا چاہتا تھا۔ اچھی سی بیوی سرکاری نوکری سادہ جیون' یہ سب اُس کی خواہشیں تھی اور اِس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

پھر اُن کے گھر والے بکرم پرشاد گورو کو مانتے تھے۔ ہر کام اُن سے پوچھ کر کیا کرتے تھے۔

اِدھر راجہ نے طلاق کے بارے میں سوچ لیا اور وکیل کے گھر جا کر طلاق کی تیاری بھی کرنے لگا۔ شیلا کے گھر والے گھبرا کر بکرم پرشاد کے پاس گئے۔

شیلا کے باپ نے گورو بکرم پرشاد سے مدد مانگی۔ اِس پر گورو بکرم پرشاد اچانک بول اُٹھے۔ ''بیٹا میں بالکل بے بس ہوں اور کچھ نہ کر سکتا ہوں۔ اچھا بن' یہ بات ہر طور سے میں کہہ سکتا ہوں' زیادہ اچھا بن' یہ نہیں کہہ سکتا۔ زیادہ اچھا بننے کے لئے زیادہ اچھا کرنا پڑتا ہے۔''

''مگر اوتار' پیغمبر.......'' شیلا کے باپ نے یہ بات کہنے کی کوشش کی مگر گورو بکرم پرشاد اچانک بول اُٹھے۔ ''ہر اِنسان کو دُنیا میں اوتار' پیغمبر یا سادھو نہ بننا ہے۔ ہر اِنسان کو وہی بننا ہے جو بننا ہوتا ہے۔'' وہ سب اُس کی طرف حیرانگی سے دیکھنے لگے۔ پھر اُس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''میں کسی کو اچھا بننے کے لئے کہہ سکتا ہوں' زیادہ اچھا بننے کے لئے نہیں۔'' آخر کار راجہ نے مقدمہ کر ہی لیا۔

پھر کیا تھا۔ مقدمہ عدالت میں چلنے لگا' تاریخ پر تاریخ پڑنے لگی۔ وہ دونوں تاریخوں پر جاتے تو کوئی مذاق کرتا' کوئی ہمدردی جتاتا' کوئی لڑکے کی طرفداری کرتا تو کوئی لڑکی کی طرفداری کرتا۔ کئی لوگوں نے اُسے رائے دی کہ ''تم دُوسری شادی کر لو' طلاق کا مقدمہ چلتا رہے گا۔'' اُدھر رانی کے اندر ایک نئی جُرأت پیدا ہو گئی ہے' اِس لئے وہ اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتی تھی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اُس کا کیا دوش ہے؟ جسم کس طرح سنبھالنا ہے' یہ تو انسان پر نربھر ہے مگر جسم کیسا ہو' یہ تو ایشور کی مرضی ہے اور پھر یہ داغ دینے والا بھی وہی ہے جس نے اُسے جسم دیا' اُس کے خاوند کو بدن دیا۔ اس

میں اُس کا کوئی قصور نہ ہے اور جب اُس کا قصور نہ ہے پھر اُسے سزا کیسے دی جا سکتی ہے۔ تاریخیں پڑنے لگیں، مقدمہ اور آگے بڑھا۔ اِدھر راجہ بھی اپنے آپ سے تنگ آ گیا۔ وہ بُرا آدمی نہ تھا مگر عام آدمی کی زندگی جینا چاہتا تھا اور عام آدمی ہی رہنا چاہتا تھا۔ نربدا نام کی لڑکی نے اُس کے قریب آنا چاہا۔ اُس نے اِشاروں ہی اِشاروں میں یہ بھی ظاہر کیا کہ اُس کا جسم بالکل ٹھیک ہے، اُس پر کوئی داغ نہ ہے۔ مگر اُس کا یہ اعلان تھا کہ وہ ایک اچھا آدمی ہے اور اچھا آدمی طلاق کے بعد ہی دُوسری شادی کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔

وقت بیتتا گیا، لفظوں کی جنگ جاری رہی۔ مگر کچھ دِن بعد ایک واقعہ اور ہو گیا کہ ایک ادھر کھڑ جوڑا وہاں پر آ گیا۔ اُس عورت کا بدن پورے طور پر پھُلبیری سے بھرا ہوا تھا۔ راجہ سیدھا اُس شخص کے پاس گیا اور اُس سے پوچھنے لگا "تُم نے اِس عورت کے ساتھ زِندگی گزاری ہے؟" اُس نے جواب دیا کہ اُس کا جسم میرے بدن کی آگ بُجھانے کو تیار تھا۔ شادی کی پہلی رات کو اندھیرا تھا، اُس کے بدن کا داغ نظر ہی نہ آیا۔ اِس کے بعد جسم جسم سے ملے۔ یہ میری پسند تھی۔ میں نے کبھی داغ دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ یہ بالکل سفید ہو گئی ہے۔ آج تم نے یاد کروایا تو مجھے اِس سلسلے میں کچھ یاد آ گیا۔ مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ مَیں بہت خوش ہوں اور مَیں نے اُس کے جسم پر ایک داغ نہیں، باقی کا سارا خوبصورت بدن دیکھا تھا۔ میری نظر داغ پر نہ پڑی۔ راجہ یہ سوچ کر پریشان ہو گیا۔ اُس نے طلاق کے کاغذات جلا ڈالے۔ اُسے خیال آیا کہ اُس نے بھی تو اُس کے جسم پر رُونما ہونے والا داغ دیکھا، حالانکہ اُس کا باقی جسم بہت خوبصورت تھا۔

***

یہ سرحدیں

وہ دھرم کو مانتا تھا۔ وہ ہندو مُسلم اور عیسائی بھی تھا اور نہیں بھی۔ کیونکہ وہ سب دھرموں کو مانتا تھا اور کسی بھی دھرم کو نہیں مانتا تھا۔ وہ پاپ اور پُن کے چکر کو سمجھتا تھا۔ وہ اِس بات کو بھی جانتا تھا کہ اِنسان کو اُس کے گناہوں کی سزا ضرور ملتی ہے اور سچائی یہ بھی کہ یہ سزا ضرور ملنی چاہئے۔ بس اِن ہی خیالوں کو لے کر وہ فوج میں بھرتی ہو گیا اور اُس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ صرف دھرم یُدھ ہی لڑے گا اور دھرم کے مطابق ہی چلے گا۔ وہ ہر روز صبح کبھی مندر سے شنکھ کی آواز سُنتا تو کبھی گرجے سے گھنٹے کی۔ اور کبھی کسی مسجد سے اذان کی آواز سنتا۔ مگر اُس نے یہ بھی جان لیا تھا کہ سبھی مذہبوں کی تعلیم یہی ہے کہ عورت عظیم ہے۔ اُس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے اور اِسی فرض کو آگے بڑھانا ہے۔ اِسی مقصد کو لے کر چلنا ہے۔ پھر وقت گزرا اور راجہ اِنہی خیالات کے ساتھ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ تقریباً ایک سال کی ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد اُسے باقاعدگی سے فوج کے اندر کام کرنے کا موقع ملا۔

اُسے ایک سرحد پر تعینات کر دیا گیا۔ وہ صبح و شام دِن رات سرحد پر پہرہ

دیتا۔ وہ اپنے فرض کا پکا تھا۔ ایک چڑیا کو بھی ادھر سے اُدھر جانے نہیں دیتا تھا۔ ہمیشہ سرحد پر سخت پہرہ دیتا۔ وطن کی حفاظت' سرحد کی حفاظت اور عورت کی حفاظت' یہ اُس کی زِندگی کا ایک خاص مقصد بن گیا تھا۔

کچھ دِنوں کے بعد ایک عجیب وغریب صبح آئی۔ وہ سرحد پر پہرہ دے رہا تھا اور چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ ایک دِلخراش واقعہ پیش آیا۔ اچانک اُس نے ایک عورت کے چیخنے کی آواز سُنی۔ وہ پریشان ہو گیا اور آواز کی طرف بھاگا۔ اُسے سرحد نظر نہیں آئی کیونکہ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ ایک عورت کا بلاتکار ہو رہا ہے۔ اُس نے رہا نہیں گیا۔ اُسے لگا کہ عورت کی حفاظت سب سے بڑا اپُن ہے۔ جو کچھ بھی اُس نے عورت کی عظمت کے بارے میں سُنا تھا وہ سب کچھ اُس کے دِل میں اکٹھا ہو گیا ہے اور ظلم کے خلاف نفرت اُس کی آنکھوں سے ظاہر ہونے لگی ہے۔ اُسے یہ سرحد ایک فضول کی چیز نظر آئی۔ اُسے لگا کہ اُس کی بہن کا بلاتکار ہو رہا ہے۔

یہ سب سوچ کر وہ بھاگا اور سرحد کے پار چلا گیا اور جاتے ہی بلاتکار کرنے والے پر ٹوٹ پڑا۔ اُس نے چونکہ تمام مذہبوں کی تعلیم حاصل کی تھی اِس لیے اُسے لگا کہ دروپدی کے آنسو اور مریم کا دِل اُس عورت کے دِل میں ہے۔ وہ خوش تھا کہ چلو ایک اچھا کام اُس کے ہاتھوں سے ہو گیا ہے۔ اُس نے وہ مذہبی فلسفے یاد کیے جن کے مطابق عورت کی عزت بچانے والے اِنسان کو جنت ملتی ہے۔ اُس نے سوچا کہ ایک نیک کام ہو گیا مگر دُوسرے ہی لمحے وہ حیران ہو گیا کہ اُس کے چاروں طرف دُوسرے مُلک کے سپاہی تھے اور اُنہوں نے اُسے گھیر لیا تھا۔ وہ اُسے پکڑ کر لے گئے اور ایک کال کوٹھری میں اُسے ڈال دیا گیا۔

اُس نے ایک سپاہی سے پوچھا۔

''میرا جرم......؟''

''تم نے سرحد پار کی ہے۔''

''مگر میں نے تو ایسا ایک عورت کی عزت بچانے کے لیے کیا ہے۔''

''مگر وہ تو دُوسرے مُلک کی ہے۔''

اُس نے کہا کہ ہر مذہب میں عورت کی عزت بچانے کی بات کہی گئی ہے ایک یا دُوسرے مُلک کی عزت بچانے کی نہیں۔ لیکن اُن سب پر اِس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اُسے ایک قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اُسے کئی اذیتیں دی گئیں۔ آخر ایک دِن اُسے فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔

''تم نے جرم کیا ہے.....؟'' کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے اُس سے پوچھا۔

''ایک اچھا کام کیا ہے۔ میں نے ایک عورت کی عزت بچائی ہے۔''

''مگر تم نے سرحد پار کی ہے؟''

''حضور عورت کی عزت بچانا بھگوان کا حکم ہے اور سرحد کی حفاظت کرنا اِنسان کا حکم............''

''خاموش......وہ عورت تمہارے مُلک کی نہیں تھی۔''

''مگر حضور! عورت کے درد کا کوئی مُلک نہیں ہوتا۔ وہ جہاں بھی ہو اُس کا بدن ایک جیسا ہے اور ظلم کے خلاف اِحتجاج بھی ایک ہی طریقے سے کرتی ہے۔ اور دُنیا میں جہاں کی بھی عورت ہو اُسے بچّے جنتے ہوئے درد ضرور ہوتا ہے۔''

کیپٹن اُس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکا تو اُس نے دوبارہ کہا۔

''تُم نے ہمارے مُلک کی سرحد پار کی ہے.......'' مگر یہ کہتے ہوئے اُس کی نظریں نیچی تھیں اور پہلے جیسا جذبہ بھی عنقا تھا۔

''جناب.........جرم کرنے کے لیے میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ جرم کو روکنے کے لیے ایسا کیا ہے۔''

لیکن کیپٹن نے اُس کی ایک بھی دلیل نہیں سُنی اور اُسے پانچ برس کی قید بامشقت دے دی۔

اِدھر اُس کے اپنے مُلک میں بھی چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔

''غدار ہے کم بخت.... دُشمنوں سے مِلا ہوا ہے۔ سرحد پار کی عورت سے اُس کے ناجائز تعلقات تھے۔ اپنی بیوی اور بچوں کو بھی دھوکہ دے گیا ہے۔''

سب کو معلوم تھا کہ وہ بے گناہ ہے مگر کوئی بھی شخص یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جب تک یہ سرحدیں قائم ہیں، اِنسانی رِشتوں کی موت ہوتی رہے گی۔ اور دُنیا میں کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اِنسانی جسم بھی محفوظ نہیں ہے۔ لہٰذا جنگ اِنسانوں کے خلاف نہیں بلکہ سرحدوں کے خلاف ہونی چاہیے اور لڑائی مُلکوں کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ عورت کی عزت بچانے کے لیے ہونی چاہیے۔

***

اِنصاف

ہر طرف شور مچ گیا کہ سزا ہو گئی ہے۔ سارے میڈیا والے پریس والے دوڑے۔ یہ سزا اُسے بلاتکار والے مقدمے میں ہوئی تھی۔ وہ بلاتکار جو کام دیو نے تقریباً سترہ برس پہلے کیا تھا۔ مگر آج سماج میں سامنے آیا تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا کہ سماج کے پیٹ میں رہنے کے بعد سامنے آیا تھا اور پیدا ہوا تھا۔ جج کی تصویر بھی اخبار میں آئی اور لوگوں کو اِنصاف کے طریقہ کار پر یقین کرنے کا ایک معقول بہانہ مل گیا۔ وکیلوں کے بیانات بھی اخباروں میں آئے۔ ملزم چُپ چاپ کھڑا تھا۔ پہلے وہ ملزم تھا مگر اب کی بار وہ مجرم بن گیا تھا۔ اخبار والوں اور میڈیا والوں نے ڈھونڈنا شروع کیا کہ وہ عورت کہاں ہے جس کے ساتھ یہ ظلم ہوا تھا۔ اُس کا اِنٹرویو لینا چاہتے تھے اور اُن کو پھر اخبارات میں شائع کرنا چاہتے تھے۔

۱۹۹۵ء کی سردیوں کی رات ہے۔ وہ اپنے گھر میں اکیلی سوئی تھی کیونکہ ماں باپ ایک رِشتہ دار کی موت کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ اکیلی ہے۔ وہ سیدھا گیا اور اُس نے دبوچ لیا۔ وہ کچھ بھی کہہ نہ سکی۔ کیونکہ اُس کی دُنیا

لُٹ چکی تھی' اُس نے یہ سارا راز اکیلے میں پی لینے کی ٹھان لی۔ مگر دُوسرے ہی لمحے میں وہ اور پریشان ہوگئی کیونکہ اُس کے پڑوسی نے یہ سب کچھ دیکھ لیا تھا اور اُس نے اُس کی آنکھیں پڑھ لی تھیں۔ وہ اُس کی کمزوری کا فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ چیخ پڑی۔ ''بچاؤ..... بچاؤ........'' محلے کے لوگ اکٹھے ہوئے۔ پھر پولیس آئی۔ پھر مقدمہ درج ہوا۔ دو سال کے بعد ملزم پکڑا گیا۔ اپنے کیس کو مضبوط کرنے کے لیے پولیس نے اُس کے بیان شروع میں ہی لیے تھے۔ تاریخیں پڑنے لگیں۔ اُدھر رانی کی شادی ہوگئی۔ شادی گاؤں سے کافی دُور ہوگئی۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ رہنے لگی۔ اُس کی ساس وسسر کو اُس سے ازحد پیار تھا اور اِس پیار کے سلسلے کو لے کر وہ آگے بڑھتے ہی گئے۔ پھر اُس کے گھر دو بچے بھی پیدا ہوئے' جو خوبصورت تھے اور اُس کے خاوند کو خوبصورت لگتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے بچوں اور زِندگی کے بارے میں کئی خواب دیکھے تھے۔ رانی صرف زِندگی میں آگے بڑھنا چاہتی تھی اور جو کچھ بھی پیچھے ہوا اُسے ہر حال میں بھولنا چاہتی تھی۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا کہ بھول چکی تھی۔

ایک بہترین زِندگی گزار رہی تھی وہ' مگر نہ جانے اچانک سب کچھ کیسے بدل گیا۔ ایک دِن صبح وہ اُٹھی۔ اپنی ساس سسر کو اُس نے نہلایا۔ پھر بچوں کو سکول بھیجا' پھر خاوند کے کپڑے تیار کیے۔ خاوند نے اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور دفتر چلا گیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے کچھ اِشارہ بھی کیا۔ رانی بازار گئی اور گھر کا سارا سامان لائی اور سب کے لیے کھانا بنانے لگی۔ اپنے ساس سسر کی بہت چہیتی تھی۔ اُن سے اُسے ازحد پیار تھا اور اِس پیار کے سہارے وہ سارا کام کر رہی تھی۔ شام ہوئی' اُس کا خاوند خوشی خوشی گھر لوٹا۔ کئی خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے' کئی اُمیدیں دِل میں لیے.......... پھر اچانک کچھ لوگ وہاں پر آگئے جو اخبار والے تھے' میڈیا والے تھے۔ اُنہوں نے اُسے گھیرا۔

''آپ آج کیا سمجھتے ہیں اِس کے بارے میں؟''

''کس کے بارے میں.....؟''

''یہی جو آج بلاتکار میں سزا ہوئی!''

''کس کا بلاتکار......؟''

''آپ کی بیوی کا۔'' خاوند کو پریس والوں نے جواب دیا۔

''میری بہو کا بلاتکار.......'' اُس کا سسر ہاتھ میں آدھا نوالہ لے کر آیا۔

''میری بہو کا شادی سے پہلے بلاتکار ہوا تھا؟''

''آج ملزم کو سزا ملی ہے۔'' پریس والوں نے کہا۔

رانی کو سب غصے اور نفرت سے دیکھنے لگے۔ ''یہ بدکردار عورت اِس گھر میں کہاں سے آئی ہے۔'' رانی کے محلے والوں نے کہا۔ رانی وہاں سے دوڑی اور بھا گی۔ معلوم نہ ہو سکا کہاں گئی ہے۔ ''گندگی سے بھری ہے۔ میرے بچوں پر بھی اپنا بُرا اثر ڈالے گی۔'' خاوند نے کہا۔ ''آج تک یہ راز نہ جانے اُس نے کیسے چھپائے رکھا۔'' سسر نے کہا۔ ''مجھے تو پہلے ہی سے اُس پر شک تھا۔'' ساس یوں بولی جیسے اُسے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہنا ہے۔

***

تمام بستی کے لڑکے و لڑکیاں اُس بڑھیا کے جھونپڑے کے صحن میں رہتے ہیں اور پھر آگ کے اِرد گرد ناچتے ہیں۔ اب اُنہوں نے نئے ساز بھی بنا لئے ہیں۔ لڑکے شام کو لکڑیاں لاتے ہیں، لڑکیاں آگ جلاتی ہیں، پھر مرد عورت مِل کر کھانا پکاتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ اُن کے چہروں پر نکھار آ گیا ہے۔ صبح اُٹھ کر آسمان کی وسعت دیکھنے کے بعد اُنہیں ہر چیز چھوٹی نظر آتی ہے۔ زمین سے محبت کرنے کے بعد نفرت اُن کے دِلوں سے کوسوں دُور چلی گئی ہے۔ اور ہوا جیسے اُن کی رِشتہ دار ہو، اور دُھوپ کوئی سگی سمبندھی۔ آنکھوں کو جسموں کو دیکھنے میں مزا آنے لگا ہے۔ اور گندم اُگانا اُنہیں یوں لگ رہا ہے جیسے وہ خود بھی اُگ رہے ہوں۔ سخت بارش میں ایک دُوسرے کے گرد وہ لپٹ جاتے ہیں اور درختوں کے نیچے بیٹھ کر گانا گاتے ہیں۔ گھاس سے اُن کی دوستی ہو گئی ہے اور صبح گائیں و بھینسیں خود تھنوں کو آگے کرتی ہیں تا کہ دُودھ نکل سکے۔ بچے جنتے ہوئے ماؤں کو اب کوئی درد نہیں ہوتا۔

یہ بوڑھی، جس کے جھونپڑے میں یہ سب آئے ہیں اِس کی عجیب کہانی ہے۔

یہ کبھی اُس بستی کی مالک تھی اور آگ جلایا کرتی تھی۔ بستی اب ترقی کر چکی تھی۔ خوبصورت گھر بن گئے تھے۔ گھروں کے اندر بے شمار قیمتی سامان رکھا گیا تھا۔ کوئی دُھواں نہ تھا اور نہ ہی ٹھنڈی ہوا تھی اور ہر چیز گرم کی جاتی تھی۔ بجلی کے ہیٹروں کا اعلیٰ اِنتظام تھا۔ اِتنی گرمی تھی کہ جانوروں کے گوشت کے ساتھ ساتھ ہڈیاں بھی جل جاتی تھیں۔ لوگوں کے بدن نازک ہو چکے تھے اور اُنہیں اِنسانی جسموں سے واقفیت نہ رہی تھی۔ صِرف ٹیلی فون پر باتیں ہوتی تھیں۔ جسموں سے جیتے نہیں بلکہ اُنہیں اِستعمال کرتے تھے۔ آگ کو وہ چھوڑ چکے تھے۔ اِس سے دُور ہو گئے تھے۔ اُن کے کمرے ٹھنڈے تھے مگر اِس سب کے باوجود ایک بات اُن کی سمجھ میں نہ آرہی تھی کہ جب اُن کے کمرے ٹھنڈے ہیں تو جسم گرم کیوں ہیں؟ اور سردیوں میں اُن کے کمرے گرم اور جسم ٹھنڈے ہو جاتے۔ لگتا تھا کہ وہ کھانا نہ کھا رہے ہوں بلکہ نِگل رہے ہوں۔

اُس خوبصورت بستی کے لوگ اُس بڑھیا سے از حد تنگ تھے، جو آگ جلایا کرتی تھی اور آگ جلا کر اُسی بستی کو کالا کیا کرتی تھی۔ لوگوں نے تنگ آ کر اپنی بستی کو خوبصورت رکھنے کے لئے ایک دِن اُس بڑھیا کو مارنے کے لئے منصوبہ بنایا تھا۔ جو منصوبہ بنایا اُس کے لئے وقت چاہئے تھا، جو اُن کے پاس نہ تھا۔ پھر اُنہوں نے یہ بھی سوچا کہ اُس کو مارنے کے بعد اُسے جلانا پڑے گا۔ اُس کی نعش کو دُور لے جانا پڑے گا۔ سردی کا موسم تھا اِس لئے لوگوں نے منصوبہ ترک کیا اور سب نے فیصلہ کیا کہ اُس کا جھونپڑا اُٹھا کر دُور لے جایا جائے اور وہاں پر اُس کو اِجازت بخشی جائے کہ جتنی مرضی آگ جلائے۔ بس پھر کیا تھا بستی والوں نے اُسے اُٹھایا اور دُور لے گئے۔ بہت دُور جا کر اُنہوں نے اُسے چھوڑا اور اُس نے وہاں آگ جلائی۔ دُھوئیں کا نام ونشان تک بھی بستی تک نہ پہنچا۔ لوگ بڑے خوش تھے۔

صُبح گھڑی دیکھ کر اُٹھتے مگر دُھوپ کا مزا نہ لے سکتے تھے۔ کیونکہ آسمان پر نکلتے ہوئے سورج کا نظارہ اُنھوں نے نہ دیکھا تھا۔ خوب کھاتے مگر مزا نہ آتا تھا۔ خوب

کپڑے پہنتے مگر بدن نہ سمجھتے تھے۔ اصل میں ننگے پن کو چھپانے کے لئے جو کپڑے پہنے جاتے ہیں اُن کا مزا کچھ اور ہوتا ہے اور ننگے پن کو ظاہر کرنے کے لئے پہنے جانے والے کپڑے جسم پر ایک بوجھ نظر آتے ہیں......اُن کی آنکھیں تھیں مگر اپنے ہی زخم نہ دیکھ سکتے تھے۔

وہ بوڑھی آگ جلاتی اور کہتی کہ ''یہ زمین سب کے لئے ہے۔ یہ پہاڑ اور درخت اِنسانوں کے لئے بنے ہوئے ہیں' آگ.....زیادہ اچھا ہوگا۔ ہوا' پانی' درخت' دُھوپ' اِنسان کے ساتھ ہی نمودار ہوئے۔ اور جوں جوں انسان آگ سے الگ ہوگا' اپنے آپ سے بھی الگ ہو جائے گا۔''

لہٰذا اُس بوڑھی کے مطابق آگ جلانا ضروری ہے اور ہوا میں گھومنا ضروری ہے۔ اور پھر آگ کی اہمیت بھی زیادہ تھی۔ کیونکہ گندگی اگر زمین پر رہتی تو اور زیادہ اُسے گندہ کر دیتی مگر اُس بستی کے لوگ اِس بات کو نہ سمجھ سکے۔ کیونکہ پانی اُنہیں گھر کے اندر ملتا تھا۔ اِس لئے دریاؤں کی روانی کو دیکھنے کا شوق نہ پیدا کر سکے۔

ایک دن جب اُس بوڑھی کو بستی کے ایک شخص نے کہا تھا ''تم بستی کو کالا کر رہی ہو۔'' اُس نے جواب دیا تھا۔ ''نہیں صاحب' آگ ہمارے جسم کے اندر رہتی ہے مگر ہم میں سے کسی کا بھی بدن کالا نہیں ہے اور پھر آگ پیدا کرو۔ گیان کی آگ' جو پاپوں کو مٹا دیتی ہے۔ دُوسروں کی مدد کرنے کی آگ جو تمہیں رحم دل بناتی ہے۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی آگ جو تمہیں قدرت کے قریب لائے گی......یہ آگ کیوں بُجھاتے ہو؟ اِس کو بجھانے کے لئے ہوا تو آگے ہی موجود ہے۔'' اُس بوڑھی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کبھی کبھی وہ بوڑھی بولتی ہے تو لگتا ہے جیسے قدرت کی وکالت کر رہی ہو۔ حالانکہ وہ اَن پڑھ ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ہوا' پانی اور روشنی کا سبق پڑھا ہو اور پڑھا بھی سکتی ہو۔

''تم آگ جلانے کی کوشش کرو۔ بجھتی تو یہ خود ہے اور پھر جب محبت کی آگ

بجھ جاتی ہے تو یہ جسم خود بخود ہی بے کار نظر آتا ہے۔

''چلو یہاں سے' ساری بستی کو کالا کر گئی ہوگی۔''

''نہیں صاحب۔''

''سورج کی روشنی.......''ایک شخص نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ہاں ہاں' سورج کی روشنی' مگر چونکہ تم سب نے قدرت سے رِشتہ توڑ دیا ہے اور بات یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اب تمہیں سورج کی روشنی کی اہمیت کا پتہ بھی نہیں چلتا ہے۔''اُس بوڑھی نے کہا۔

سب اُس بوڑھی کو گالیاں نکالتے تھے حالانکہ وہ اُن کی دادی تھی۔ اُس نے اُن کی ماؤں اور دادیوں کو ماں بننے کا آشیرواد دیا تھا مگر اِس سب کے باوجود ایک بات......وہ سب کے لئے زِندہ رہنے کی دُعا اِس لئے کرتی تھیں کیوں کہ اُسے اِس بستی کا انجام معلوم تھا۔ پھر کیا ہوا' ایک دِن اُس بستی میں ایک عجیب واقع ہوا۔ دریا اُچھلا۔ لوگوں کے گھروں میں پانی بند ہو گیا۔ بجلی بند ہو گئی۔ سردی کا موسم تھا' لوگ ٹھٹھرنے لگے۔ گھبرا گئے۔ چونکہ ٹیلی فون کا ہی اِستعمال کرتے تھے۔ یہ بھی اُن کی پریشانی کا عالم تھا۔ اب وہ جسموں کو کیسے گرم کریں؟ کیونکہ پانی نہ آنے کی وجہ سے ہر چیز بے کار سی نظر آ رہی تھی۔ حالانکہ سچائی یہ بھی تھی کہ زمین کے نیچے پانی ہی پانی تھا مگر چونکہ اُنہیں دفتروں کے ایڈریس ہی یاد تھے اِس لئے وہ پانی کا پتہ بھول چکے تھے۔ زِندگی جیسے موت کا سایہ ہو۔ اُنہوں نے سوچا کہ ٹیلی فون پر رِشتے قائم کرتے ہوئے کاش اُنہوں نے اپنے لہو کا رنگ نہ بدلا ہوتا۔ دُوسرے کے جسموں کے ساتھ لپٹنے کے بجائے رُوحوں سے محبت کی ہوتی۔ ڈاکٹر' انجینئر' وکیل ہونے کے بجائے اِنسان ہونے پر فخر کیا ہوتا۔ اپنے کپڑوں و قیمتی سامان کے بجائے اپنی آنکھوں' کانوں اور ہاتھوں کی اہمیت کو سمجھا ہوتا۔

افراتفری مچ گئی۔ پاؤں کے ہوتے ہوئے وہ اپاہج نظر آئے۔ ٹانگیں جیسے

جسم کا بوجھ اُٹھانے کے بجائے اُس کا بوجھ بڑھا رہی ہوں مگر ساتویں جماعت کا ایک طالب علم، جو ہر روز صبح اپنی کھڑکی سے دریا کی روانی دیکھا کرتا تھا، جس سے لگتا تھا کہ قدرت اِنسان کی ہر خطا معاف کرنے کو تیار ہے۔ اُس نے اُٹھتے ہی الماری سے ایک کتاب نکالی جس میں آگ کے متعلق لکھا تھا۔ پانی کے متعلق بتایا گیا تھا۔ یہ کتاب نہ جانے کیوں اُس نے سنبھال کر رکھی تھی۔

''آگ.... آگ..... آگ......'' اُس لڑکے نے شور مچایا۔ اُس بستی کو لگا کہ وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عمر رسیدہ لوگوں نے کہا کہ اُنہیں یاد ہے کہ دُور بستی میں ایک بوڑھی آگ جلایا کرتی تھی۔ اُنہوں نے اُسے دُور بھگایا تھا۔ بستی تو کالا ہونے سے بچ گئی، یہ خوبصورت رہی مگر اُن کے دِل کالے ہو گئے۔ جو گرم پانی اور گرم ہوا اُن کے گھروں میں آیا کرتی تھی اُس سے سب کچھ کالا ہو گیا۔ آنکھوں کی بینائی اِتنی کمزور ہو گئی کہ اُنہیں یہ سب کالا ہوتے ہوئے بھی دِکھائی نہ دیا۔ وہ اندر اور باہر سے کالے ہو گئے۔ اُن کے خون لال نہ رہے تھے۔ بس وہ آہستہ آہستہ تیار ہوئے اور دُور اُس بوڑھی کے پاس چلے گئے جس نے آگ جلا رکھی تھی۔

لوگ شرمندہ تھے۔ آہستہ آہستہ اُس کے پاس جا رہے تھے۔ اُس کا بدن دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کہیں وہ زخم موجود نہ ہیں جو اُنہوں نے پہنچائے ہوئے تھے۔ مگر اُنہیں دیکھ کر وہ بوڑھی رو پڑی۔

''آؤ میرے بچو آؤ...... میں آگ جلاتی ہوں...... جو نفرت جلا دے گی۔ میرے زخم تو کبھی تھے ہی نہیں....... آگ سے رشتہ جوڑو........ ہوا سے جوڑو اور پانی سے جوڑو.........''

نہ جانے کیوں نوجوان لڑکیاں و لڑکے خود بخود آگ کے گرد گھومنے لگے۔ پہلی بار اُنہوں نے ہوا کو محسوس کیا اور پانی کا چشمہ دیکھا۔ پھر اُنہیں ایک دُوسرے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اُن کے اندر گھر بنانے کا شوق پیدا ہوا۔ گھر، جس میں

رِشتے ناتے رہتے ہیں لوگ رہتے ہیں۔ جو ایک دُوسرے کے دُکھ درد سمجھتے ہیں۔

صبح اُٹھتے ہی لڑکیاں آگ جلاتی ہیں۔ لڑکے لکڑیاں لاتے ہیں۔ پھر سکول چلے جاتے ہیں۔ عورتیں اپنے گھروں میں کھانا پکاتی ہیں۔ پھر شام کو سب ناچتے گاتے ہیں۔ آگ جلاتے ہیں۔ اُس کے گرد ناچتے ہیں۔ اُن کے دِل میں ایک دُوسرے کے لئے درد پیدا ہو گیا ہے۔ محبت ہو گئی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے جسموں کا مزا لیتے ہیں۔ آنکھوں کے ذریعے اُن کے گیت سُن کر اُن کے کان جھوم اُٹھتے ہیں۔ جسم کا انگ انگ مزا لیتا ہے۔ عورتوں کو آگ جلا کر کھانا بنانے میں مزا آتا ہے اور مردوں کو تازہ کھانا کھانے میں۔ نوجوان آگ کے گرد ناچتے ہیں۔ آنکھوں سے ایک دُوسرے کے جسم کا مزا لیتے ہیں۔ کانوں سے ایک دُوسرے کے لفظ سُن کر خوش ہوتے ہیں۔ اُدھیڑ عمر کے لوگ آگ جلاتے ہیں۔ پھر کنویں سے ٹھنڈا پانی لاتے ہیں اور بوڑھے اُونچے ٹیلوں پر بیٹھ کر اِن سب چیزوں کا مزا لیتے ہیں اور اِنہیں یہ پیغام دیتے ہیں......

"زِندگی جینے کا نام ہے۔"

***

وہ کدھر جائے

بہت خوبصورت تھا دیارام، نوجوان، ہٹا کٹا۔ بڑے ناز و انداز سے اُس کے ماں باپ نے اُسے پالا تھا اور پھر کبڈی کا پلیئر تھا۔ سارا گاؤں اُس سے محبت کرتا تھا اور وہ بھی سارے گاؤں کا ہی پیارا تھا۔ بیساکھی کے دِن پینگیں چڑھاتا تھا اور خوب اُونچی پینگ اُڑاتا۔ لگتا کہ دیارام آسمان کو چھونے لگا ہو۔ بس سلسلہ در سلسلہ آگے بڑھنے لگا۔ ایک دِن وہ پینگ چڑھا ہی رہا تھا کہ گوری نام کی لڑکی وہاں پر آ گئی۔ پینگ پر بیٹھی، دیارام نے جوں ہی اُسے دھکا دینے کی کوشش کی اُس کی اُنگلیاں اُس کے بدن سے ٹکرا گئیں۔ بس اُسی سے پھر ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ سلسلہ آگے بڑھتا ہی گیا۔ وہ دونوں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ سارے گاؤں میں چرچا ہوا اور پھر گاؤں والوں نے مل جُل کر اُن کی شادی کروادی۔ وہ دونوں ایک خوبصورت اور حسین زندگی جی رہے تھے۔ مگر غربت میں بٹے ہوئے تھے۔ دیارام کی غریبی اُس سے کئی سوال کرتی تھی لیکن گوری کا خوبصورت جسم ہر بات کا جواب تھا۔ اگر گھر میں فرج نہ ہے، کولر نہ ہے، کبھی کبھی نمک کے ساتھ روٹی کھانی پڑتی ہے، مگر ایک دُوسرے کو دیکھنے میں اُنہیں بہت مزا آتا تھا۔ پھر اُن کے گھر ایک بچی بھی پیدا ہوئی۔ ایک دن دیارام کے پاس کچھ لوگ آئے اور اُسے کہنے لگے کہ اِس شہر میں ایک بہت بڑا ہوٹل ہے جس کی آخری

چھت گھومتی ہے۔ چلو وہاں چل کر تمہیں کھانا کھلاتے ہیں اور تمہاری گوری کو بھی۔
دیارام اُس لالچ میں آ گیا اور اُس بڑے ہوٹل میں کھانا کھانے کے لئے چلا گیا۔ گوری کو وہ ہوٹل بالکل پسند نہ آیا اور نہ ہی وہاں کا کھانا گوری نے پسند کیا۔ باہر آئی تو اُسے اُلٹی ہوگئی۔ مگر دیارام کو یہ لالچ دیا گیا کہ گوری کے جسم پر پیلی ساڑھی ہوگی۔ بلکہ گوری کی باہوں پر کانچ کی نہیں سونے کی چوڑیاں کھنکیں گی اور اُس کے پاس بے شمار کپڑے ہوں گے۔ گوری جتنی چاہے کلفیاں کھائے گی۔ بس ایک سلسلہ چلے گا۔ دیارام نے سوچا کہ وہ گھوڑی پر چڑھ کر گوری کو بیاہنے کے لئے جا رہا ہے۔ لڑکیاں گیت گا رہی ہیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی ماں کا علاج ہو رہا ہے۔ یہ سوچ کر دیارام نے ہاں کر دی۔

دیارام کو ایک وردی دی گئی اور ایک نیا نام بھی ''جاسوس''، وہ جاسوس بن گیا اور ایک دِن اُسے سرحد کے پار لے جایا گیا۔ وہاں پر ایک بوڑھی کا بیٹا گم ہو گیا تھا۔ اُسے یہ بتایا گیا کہ اُس کا بیٹا تیس سال کے بعد مل گیا ہے۔ وہ اس بوڑھی کا ہو گیا اور وہ اُس کے بیٹے کی طرح ہی وہاں پر رہنے لگا۔ وہ بوڑھی عالمی اُس کی دادی بن گئی۔ گاؤں میں جشن ہوا کہ عالمی کا پوتا واپس آ گیا ہے۔

عالمی کا بڑا لڑکا فساد میں مارا گیا تھا اور اُس کا پوتا کہیں پر گم ہو گیا تھا۔ عالمی نے اپنی بہن رجو کو زبان دی تھی کہ وہ اُس کی پوتی حمیدہ کی شادی اپنے پوتے سے کر دے گی۔ حمیدہ جوان ہو گئی تھی اور نہایت ہی خوبصورت۔ اب دیارام جو کہ وہاں پر اسلم بن گیا تھا۔ اُسے حکم ہوا تھا کہ وہ حمیدہ سے پیار کرے تا کہ وہاں پر رہ کر جاسوسی کر سکے۔ دیارام نے جاسوسی کا کام شروع کر دیا تھا۔ صبح وشام اپنے ملک کو خبریں بھیجتا تھا۔ دن رات کی خبریں اور پھر اُس نے تمام فوجی ٹھکانوں کے نقشے بنائے تھے۔ وہ ایک جاسوس بن گیا تھا۔ وہ گوری کو بھولنے لگا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں حمیدہ میں اُسے گوری نظر آتی تھی اور حمیدہ کو چاہنا اُس کی ڈیوٹی تھی۔ محبت اُس کے فرض کا حصہ بن گیا

تھا اور اسے چاہنا ہی پڑتا تھا۔ دن رات کا یہ سلسلہ چلنے لگا۔ اسلم ایک دوکان پر نوکر ہو گیا تھا۔ گھر کی زمینداری بھی تھی۔ آہستہ آہستہ نہ جانے کیوں اُسے حمیدہ گوری سے الگ ہو کر اچھی لگنے لگی۔

مگر وہ گھبرا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ وہ دُوسرے ملک کا ہے اور جاسوس ہے۔ وہ اِس ملک کا دشمن ہے۔ اِس ملک کا ہر شخص اُس کا دشمن ہے، یہاں تک کہ حمیدہ بھی۔ مگر اُسے تو مجبوراً اُس سے پیار کرنا تھا۔ یہ رِشتہ نبھانا تھا۔ حمیدہ اُس کی دُلہن نہ تھی وہ ایک جاسوس کی دُلہن تھی۔ وہ دن رات اور پریشان رہنے لگا۔ اب اُسے جاسوسی کرنے کا دل نہ کرتا تھا۔ اُس ملک کے لوگوں سے اُسے ہمدردی ہونے لگی تھی۔

ایک دِن ایک عجیب واقعہ ہوا کہ اُس کو ایک حادثہ پیش آیا۔ وہ سخت زخمی ہو گیا اور اُسے ہسپتال لے جایا گیا۔ وہاں پر حمیدہ کے بھائی نے اُسے خون دیا۔ وقت اور آگے بڑھا۔ پھر اُس کے گھر ایک بچہ بھی پیدا ہو گیا۔ مگر اُسے حکم ہوا کہ وہ بچے سے پیار نہ کرے۔ مگر ایسا کرنا اُس کے لئے ممکن نہ تھا۔ اُس کی اِنکری منٹ بند ہو گئی۔ اِدھر گوری کے ہاں بھی ایک بچے نے جنم لیا۔ مگر ایک دن وہی ہوا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اسلم پکڑا گیا۔ اُسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اُسے سزا ہو گئی پانچ برس کی...... مگر اُس کی دادی بار بار یہ کہہ رہی تھی کہ وہ اُس کا ہی پوتا ہے۔ اُس کا لڑکا کہہ رہا تھا کہ وہی اُس کا والد ہے۔ وقت اور بیتا۔ اِدھر ایک دُوسرے ملک کا جاسوس پکڑا گیا۔ پھر جاسوس کی ادلا بدلی ہو گئی۔ مگر اسلم سرحد کے بیچ کھڑا ہے۔ ایک طرف اُس کا ایک بیٹا ہے اور دُوسری طرف دُوسرا بیٹا۔ ایک طرف ایک بیوی کھڑی ہے تو دُوسری طرف دُوسری بیوی۔ اسلم سماج سے پوچھ رہا ہے کہ ''میں کس کا ہوں' کوئی تو جواب دے۔'' وہ دونوں ملکوں کے سربراہوں سے پوچھ رہا ہے کہ میں کدھر جاؤں۔

***

دُوسرا بٹوارہ

موہن لعل نے کہا'' کیا وہ دِن لوٹیں گے؟''

'' آپ کس سے بات کرر ہے ہو؟''ٹیٹو نے پوچھا۔

''میں بات کرر ہا ہوں.....؟ ایسا نہیں ہے بیٹا۔''

'' کیوں ایسا نہیں ہے' میں نے خود آپ کو بات کرتے ہوئے سُنا۔''

''نہیں بیٹا میں بات نہیں کرر ہا تھا۔ کیونکہ بات وہ ہوتی ہے جو دُوسروں سے کی جاتی ہے۔ میں تو خود ہی اپنے آپ سے کچھ کہہ رہا تھا۔''

پھر ٹیٹو نے پوچھا'' ذرا بتاؤ تو سہی۔''

موہن لعل نے کہا کہ'' رات کو تقریباً تین سبزیوں کے ساتھ ہم کھانا کھاتے تھے اور اچار تو کئی قسم کا ملتا تھا۔''

'' مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟''ٹیٹو نے پوچھا۔

''یہ ہوا تھا اور ہوتا تھا۔''

''مگر کیسے.......؟''

''یہ سوال تم سوہن لعل سے پوچھو۔ دادا نے کہا۔

''مگر پپا تو وہاں جانے سے منع کرتے ہیں۔''

''کسی بھی طریقے سے وہاں جاؤ......'' ٹیٹو اب اُدھر جانے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

اصل میں موہن لعل اور سوہن لعل دو سگے بھائی تھے۔ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک دُوسرے کا دُکھ درد بھی سمجھتے تھے اور رِشتوں کو نبھانے کا فن بھی جانتے تھے اور ساتھ میں اُن کے چچازادوں کا گھر تھا۔ وہاں پر اُن کے چچازاد بھائی رہتے تھے۔ اُن کے بچے بھی تھے۔ پھر کیا ہوا موہن لعل کا لڑکا کرکٹ کا پلیئر بن گیا اور اِتنا مشہور ہوا کہ اُس نے ہزاروں روپیہ کمایا اور پھر سوہن لعل کا لڑکا بیڈمنٹن کا پلیئر بن گیا۔ وہ دُنیا میں مشہور ہو گیا۔ اُس نے بھی لاکھوں روپیہ کمایا۔ باہر اُن کی دو دو دکانیں تھیں۔ ایک دوکان پر پنساری کا سامان تھا اور دُوسری میں کریانے کا سامان۔ پنساری کا سامان لینے والا کریانہ بھی لیتا اور کریانہ لینے والا پنساری بھی۔ خوب چلتا تھا اُن کا کاروبار اور چچازاد بھائیوں کا کھانے کا ریسٹورینٹ بھی خوب چلتا کیونکہ جو پنساری لینے آتا وہ کریانہ بھی لیتا اور ریسٹورینٹ میں بیٹھ کر چائے بھی پیتا۔ گھر کے اندر ایک لمبا سا دالان تھا' جہاں سب کا سامان تھا۔

کئی بار عورتیں ایک دُوسرے کی ساڑھیاں پہنتی تھیں۔ لگتا کہ اُن کے پاس بے شمار کپڑے ہیں اور کھانے میں کئی سبزیاں ملتی تھیں' کئی اچار تھے۔ اُن کا آنگن بھی بہت بڑا تھا۔ جہاں پر وِکٹیں لگا کر اُن کے بچے کرکٹ کھیلا کرتے تھے اور ساتھ میں بیڈمِنٹن بھی۔ گھر کے سارے افراد اور کچھ محلے کے لوگ مل کر کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ آنگن اِتنا بڑا تھا کہ بچوں کے کھیلنے میں کوئی تکلیف نہ تھی۔ سب دُھوپ کا مزا لیتے تھے اور ہوا سے پیار کرتے تھے۔ لوہڑی تہوار اکھٹے مِل کر مناتے تھے۔ دیوالی پر جب

سب مِل کر بم چلاتے تو لگتا کہ آسمان ڈھل گیا ہو۔ وہ سب تھوڑے لاتے مگر جب چلاتے تو لگتا کہ اُنہوں نے بے شمار بم لائے ہیں۔ لوگ اُن سے صلاح لینے کے لئے آتے تھے۔ وہ سارے محلے کے جھگڑے نمٹاتے تھے۔

نہ جانے ایک دِن کیا ہوا۔ موہن لعل کے لڑکے کی شادی نربدا نام کی لڑکی سے ہوئی۔ نربدا جس گھر سے آئی تھی وہاں پر اُس کا باپ اُس کے چچا سے الگ ہو گیا تھا اور یہاں تک بات تھی کہ وہ جب اُس کی ڈولی کی الوداعی ہوئی تب بھی نہ آیا تھا۔ پہلی ہی رات کو نربدا نے درشن سے اُس کے خاندان کے بارے میں پوچھا۔ نربدا یہ جان کر حیران ہو گئی کہ یہ لوگ اِکٹھے رہتے ہیں۔ درشن سے اُس نے کہا' جو مزا الگ رہنے میں ہے وہ اکٹھے رہنے میں نہ ہے۔ نربدا نے ایک دِن کھانا کھایا اور اُلٹی کر دی اور کہا کہ وہ اپنا بنایا ہوا کھانا ہی کھا سکتی ہے۔ اِس پر الگ ہونے کا سلسلہ شروع ہوا۔ خاندان بٹا' گھر بٹا' پھر کاروبار بٹا۔ سب نے ایک ہی قسم کی دو کانیں ڈالیں۔ مقابلہ شروع ہو گیا اور سب کو محسوس ہوا کہ اب کوئی بھی اِس گھر کا کرکٹ کا پلییر نہ بنے گا۔ موہن لعل اور سوہن لعل نہ چاہتے ہوئے بھی اِسے روک نہ سکے۔ اِس کا اثر اُن کے چچازاد بھائیوں پر بھی ہوا۔

مگر اِس سے پہلے ایک بات اور بھی ہوئی تھی وہ یہ کہ ٹیٹو نے موہن لعل سے پوچھا تھا۔ ''یہ چچازاد بھائی کیا ہوتے ہیں؟''

''چچازاد بھائی.........یعنی کہ سوہن لعل کے بیٹے.........' تمہارے پپا کے چچازاد بھائی ہیں۔''

''وہ کیوں.......؟''

''کیونکہ میں اور سوہن لعل سگے بھائی ہیں۔'' ٹیٹو نے حیرانگی سے پوچھا۔

''آپ کے چچازاد بھائی ہیں.......میں اور نارائین بھی.........پھر.....''

''بیٹا یہ سلسلے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔''

''اور مجھے ....''

موہن لعل نے کہا۔ ''تو پڑھ، یہ سب تیرا کام نہ ہے۔''

پہلے اگر ایک ہفتے ایک دِن جوڑا سینما دیکھنے جاتا تھا تو دُوسرے دِن دُوسرا جوڑا۔ مگر اب ہر ایک کو اپنے بچوں کا خود خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کانتا ایک دِن دُودھ لینے کے لئے بازار گئی تھی کہ اُس کا بچہ نالی میں گر گیا۔ اِدھر نربدا کی نند اِنتہائی پریشان تھی کہ راکھی کے دِن پہلے راکھی کسے باندھے۔ چار سبزیوں کے ساتھ کھانے کا مزا لینے والے سوہن لعل اور موہن لعل کو ایک ہی قسم کی سبزی کھانی پڑ رہی تھی اور بیمار ہونے پر دوائی تک مِلنا مشکل ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ چونکہ صحن ہی بٹ گیا تھا ایک طرف روشنی نہ آنے کی وجہ سے بیماری پھیل رہی تھی اور دُوسری طرف روشنی زیادہ آنے کی وجہ سے۔ پانی بھی ایک گھر کا اکٹھا ہوگیا۔ عورتوں کو زیادہ کام کرنا پڑتا۔ موہن لعل اور سوہن لعل کے بٹوارے کا اثر آگے بھی ہوا۔ اُن کے گھر بھی بٹے۔ اب ڈرائنگ رُوم نہ رہے، اب مہمان خانے نہ رہے کیونکہ ایک رسوئی کی کئی رسوئیاں بنیں۔ ایک باتھ رُوم کی جگہ کئی باتھ رُوم بن گئے۔ ایک ڈرائینگ رُوم کی جگہ کئی ڈرائینگ رُوم۔ ٹیٹو نے ایک دِن بغاوت کر دی اور سوہن لعل کے گھر اُس نے زبردستی گیند پھینکا۔

اُس کے باپ نے کہا...... ''اب وہ تمہیں گیند نہیں دیں گے اور تُو وہاں جا بھی نہیں سکتا ہے۔''

''نہیں...... جاؤں گا۔''

''مگر وہ پوچھیں گے تو یہاں کیسے آیا.....؟''

''ہاں، کہوں گا میں نہیں آیا۔ مجھے گیند لے آیا ہے۔''

ٹیٹو سیدھا سوہن لعل کے پاس چلا گیا اور اُس سے پوچھنے لگا۔ نربدا بھی اب پریشان ہوگئی۔ ٹیٹو نے پوچھا کہ کیا موہن لعل سب ٹھیک کہتا ہے اور ساری بات سُنا دی۔ اِس پر سوہن لعل نے کہا کہ ٹھیک نہیں بالکل ٹھیک ہے۔ اُس نے کہا کہ میں اب

پورے آنگن میں سائیکل چلاؤں گا۔ وہ سب چُپ رہے۔ اِدھر نربدا کو اپنے میکے جانا تھا' گھر میں گئی۔ وہ اور درشن نربدا کے میکے پہنچے۔ تو اُس کی ماں نے فوراً حلوہ لایا' چچی گئی تو چائے لائی' تائی نے کہا کہ سُنا ہے کہ درشن کو دلیا پسند ہے۔ گھر کا سارا ماحول بدلا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر نربدا حیران ہوگئی۔ باپ نے فوراً کہا۔ ''بیٹا جب تیری ڈولی گئی تھی تو صرف ایک رات کے لئے تمہارے گھر میں رُکا تھا۔ گھر کا ماحول' ایکتا اور محبت بھرا دیکھ کر میں نے یہاں آ کر کہا تھا۔

''لوگ زِندگی میں ایک بار تیرتھ کرتے ہیں مگر میری بیٹی تو تمام زِندگی تیرتھ ستھان میں رہے گی۔ اِن سب کو جب میں نے تمہارے گھر کا ماحول بتایا تو ہماری دیواریں ٹوٹ گئیں اور آنگن ایک ہوگئے۔ کیونکہ ملک بٹنے سے ایک بٹوارہ ہوا تھا' اب گھر بٹنے سے ہم دُوسرا بٹوارہ نہ کر سکتے تھے۔

***

جج صاحب

بس پھر کیا تھا، اس سال بھی گُرداس مل نے سنگیت کے مقابلے کے لئے لوگ اکٹھے کر لئے تھے۔ بچوں کا مقابلہ تھا۔ پہلا اِنعام پانے والوں کو بیس ہزار روپیہ اور نوکری، دُوسرے کو دس ہزار روپیہ اور تیسرے کو پانچ ہزار روپیہ۔ اخبارات میں خوب اِشتہار شائع ہو گئے اور اِس بار سب سے اہم بات اِس مقابلے کی یہ تھی کہ نیرج کمار شرما نے بطورِ جج کام کرنا تھا، جو کہ ایک مشہور سنگیت کار تھا اور سماجی محفلوں میں بھی اُس کا ایک اہم نام تھا۔ اُس نے سنگیت کے مقابلے کا اعلان کر دیا۔ لڑکیوں نے ڈانس کرنا تھا اور اُن لڑکیوں کی عمر بیس برس سے کم کی تھی اور سب سے مشہور سنگیت کار نیرج کمار کو جج مقرر کیا گیا۔ نیرج کمار پورا ایماندار نہ تھا مگر سیاست دانوں کی طرح پورا بے ایمان بھی نہ تھا۔ پولیس کی بھرتی میں ساری بے ایمانی ہوتی تھی اور پھر ججوں نے بھی اپنے گھروں میں کام کرنے والے لوگوں کو نوکری دے دی لیکن نیرج کمار ایک انعام قابلیت پر دے گیا۔ ایک پیسے کھا کر اور ایک سفارش پر۔ گُرداس مل نے اِس بات کو سمجھ کر اُسے جج بنایا کیونکہ کچھ نہ کچھ قابلیت بھی دُنیا چلانے کے لئے چاہئے۔ کسی بڑے سیاسی لیڈر یا

پولیس آفیسر کوخوش رکھنا بھی ضروری ہے۔ گرداس مل چونکہ بائیں بازو کی فلاسفی پر یقین رکھتا تھا اِس لئے چاہنے کے باوجود اپنے دل سے مکمل طور پر انصاف کے درخت کو اُکھاڑ نہ سکا تھا۔ اِس لئے تین میں سے ایک اِنعام قابلیت پر دینا چاہتا تھا اور نیرج کمار بھی ابھی تک مکمل طور پر بے ایمان نہ ہو سکا تھا۔ ہو بھی جاتا مگر جس ستار کو وہ بجاتا تھا وہ اُسے ایسا نہ کرنے دیتی تھی۔ پھر مقابلے میں کافی تعداد میں لوگ آئے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ اُس کی لڑکی فسٹ آئے۔ نیرج کمار سب کی آنکھوں کو پڑھ رہا تھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اِشارہ کرر ہا تھا ''فکر مت کرو سب ٹھیک ہوگا۔''

آنکھیں بھی عجیب چیز ہیں کبھی کبھی خود بولتی ہیں اور پھر اِنسان کا اِن پر کنٹرول نہیں رہتا۔ جب اِنسان گناہ کرتا ہے تو شرمندہ ہو جاتی ہیں۔ جسم تو خوبصورت کپڑے پہنتا ہے، چہرہ سج جاتا ہے مگر آنکھیں اپنی شرمندگی کو چھپا نہیں سکتی ہیں۔ جب کوئی پولیس والا رِشوت لیتا ہے تو اُس کی آنکھیں اِحتجاج کرتی ہیں۔ جب کوئی بلاتکار کرتا ہے تو فوراً کہہ اُٹھتی ہیں ہمارے سامنے ہوا ہے مگر ہم بے بس ہیں، زبان ہمارے بس میں نہ ہے۔ سب کی آنکھیں نیرج کمار پر تھیں اور نیرج کمار کی آنکھیں سب پر۔ ابھی تماشہ شروع ہی ہونے والا تھا کہ جج کیلاش ناتھ جوشی بھی اپنی لڑکی کو لے کر آئے۔ سب حیران ہو گئے کہ جج صاحب آگئے ہیں۔ نیرج کو تو پسینہ آگیا۔ کتنا بیٹی سے ہے اُنہیں۔

جج کیلاش ناتھ جوشی بڑے مشہور ہیں۔ ہر ایک کو خوش کرتے ہیں۔ تمام وکیلوں کی خواہش رہتی ہے کہ وہی اُن کا مقدمہ سُنیں۔ چھٹیوں میں بھی لوگ دُعا کرتے ہیں کہ اُن کا مقدمہ جج کیلاش ناتھ جوشی کے پاس ہی لگے۔ پچھلی چھٹیوں میں اُنہوں نے تمام وکیلوں کو سٹے آرڈر دیئے۔ اشرف نامی وکیل جب کھڑا ہوا تو اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا، میرے بھی بال بچے ہیں، مجھے بھی چھٹیوں کا مزہ لینا ہے۔ اِس پر جوشی نے سٹے آرڈر جاری کرتے ہوئے آنکھوں سے کہا۔ ''اے تو بھی لے، ایک دو مہینے شکل

نہ دِکھانا۔'' وکیل گوکل نے کھڑے ہو کر آنکھیں لال کیں، گویا کہہ رہا ہو اپنوں کو دیتے ہو۔ کیلاش ناتھ نے سٹے آرڈر یوں جاری کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ نہ جانے کہاں سے آجاتے ہیں۔ پھر دُوسرا وکیل، جس کی بیوی بیمار تھی، کھڑا ہوا۔ کیلاش ناتھ نے کہا ابھی لے جا آرڈر، مگر بیوی کے بعد اب یہ نہ کہنا کہ میری بیٹی بھی بیمار ہے۔

کیلاش ناتھ بھی کچھ مقدموں کا فیصلہ بالکل ٹھیک کیا کرتا ہے تاکہ لوگوں کو عدالتوں کے نظام پر یقین رہے اور کچھ فیصلے اپنی بیٹی کے کہنے پر کیا کرتا ہے، کچھ اپنے بیٹے کے کہنے پر اور کچھ فیصلے اپنی بیوی کے کہنے پر اور سال دو سال میں کبھی کبھی بہنوں کو بھی خوش کر دیا کرتا ہے۔ مگر کچھ مقدموں میں بالکل اڑ جایا کرتا ہے گویا یہ پیغام دے رہا ہو کہ وہ اِنصاف کے معاملے میں کسی کی بھی نہ سُنے گا۔ بس وہی مقدمے اُسے ایماندار بنائے ہوئے ہیں۔ پچھلے برس اُس نے ایک دُور پار کے رشتہ دار کے خلاف فیصلہ کر کے اپنی ایمانداری کو اور مضبوط کر دیا تھا۔ حالانکہ سچائی یہ تھی کہ اُس رشتہ دار کے ساتھ اُس کے تعلقات بہتر نہ تھے۔ کیلاش ناتھ نے اپنی ایمانداری ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ اُس رشتہ دار سے بدلہ بھی لے لیا تھا۔

گُرداس مل پہلے سیاست دانوں و منسٹروں کو بلایا کرتا تھا مگر جب اُسے معلوم ہوا کہ پولیس والے سیاست دانوں کی ذرا کم سننا شروع ہو گئے ہیں تو اُس نے پولیس کے آفیسروں کو بلانا شروع کیا کیونکہ تقریباً منسٹر رشوت کے مقدموں میں پھنسے ہوتے ہیں اور اُنہیں پولیس والوں سے بچنا ہوتا تھا۔ اِس لئے پولیس کی اہمیت بڑھ چکی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ گُرداس مل کے کاروبار میں سیاست دانوں نے مدد کی تھی۔ کالج کھولنے کی اجازت دی تھی اور کچھ سیاست دانوں کی کافی عزت بھی تھی۔ اِس لئے نہیں کہ وہ ایماندار تھے بلکہ اِس لئے کہ وہ پیسہ لے کر کام کرتے تھے اور جس سے پیسہ لیتے تھے اُس کا کام ضرور کرتے تھے۔ اب کچھ لوگ یقین کر چکے تھے کہ سیاست دان ایماندار ہو ہی نہیں سکتا اور پھر اِس بات کا اعلان بھی سڑکوں پر لوگ، باتوں میں کرتے

تھے کہ ایمان دار لوگوں کو سیاست میں نہ آنا چاہیئے اور مزے کی بات تو یہ بھی کہ گاندھی جینتی کے موقعہ پر ہی ایسا کرتے تھے۔

مگر بعد میں یہ معلوم ہوا کہ پولیس والوں کے جرم بھی عیاں ہونے لگے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تھانے محفوظ قتل گاہیں بن گئے ہیں اور ایماندار آفیسروں کو تھانے میں نہ لگایا جاتا ہے۔ ہر اہم جگہ پر رشوت خور آفیسر بیٹھے ہوئے ہیں اور مفاد عامہ کے مقدموں کی وجہ سے جج اور وکیل طاقت ور ہو گئے ہیں اور ججوں کو پولیس والوں کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے کہ پولیس والا ملزم کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے یا ہو گا۔

اِس لئے گرداس مل نے اب کی بار جج کو بلایا اور مہمانِ خصوصی بنایا۔ اور ایسا کرنے سے اُسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ پولیس اور سیاسی لیڈر اُس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کریں گے۔

کیلاش ناتھ جوشی نے اپنی بیٹی کنول کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ ایک بار اُس کے ایک ہم جماعت کا باپ چوری کے اِلزام میں پکڑا گیا تھا اور تین دن تک عدالت میں بحث مباحثہ چلتا رہا۔ بڑی بڑی کتابیں پیش کی گئیں۔ وہ ملزم کنول کے ٹیچر کا بھی رشتہ دار تھا۔ اُس دِن کنول نے اِمتحان دیا تھا اور ماسٹر نے ۱۰۰ میں سے ۱۰۱ نمبر دیئے تھے اور ساتھ میں اُس چور کو چھڑوانے کے لئے بھی کہہ دیا تھا۔ کنول نے جج کیلاش ناتھ جوشی سے پوچھا۔ ''پپا کہاں جا رہے ہو؟''

''آج چوری کے مقدمے کا فیصلہ سُنانا ہے۔''

''پپا اُس کو بری کر دینا' میرے ٹیچر کا رشتہ دار ہے اور پھر میرے ٹیچر نے انٹرنل کے نمبر بھی دینے ہیں اور میں فسٹ آنا چاہتی ہوں۔'' وکیلوں کی کتابیں دھری کی دھری رہ گئیں اور دلیلیں بھی وہیں کی وہیں رہ گئیں اور وہ چور بری ہو گیا اور ساتھ ہی سامان بھی اُسے مل گیا' حالانکہ جج صاحب کی لڑکی یہ نہ چاہتی تھی کہ سامان ملے۔ مگر جب ایک سو میں سے ایک سو ایک نمبر ہو سکتے ہیں تو چور کے بری ہونے کے ساتھ

سامان بھی مل سکتا ہے۔

بس مقابلہ شروع ہونے والا تھا۔ کیلاش ناتھ جوشی کی موجودگی نے سب کو چونکا دیا۔ نیرج کمار گھبرا گیا۔ جج صاحب آ گئے ہیں۔ اُن کی موجودگی کو دیکھ کر ہر آدمی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لڑکوں نے لڑکیوں کو دیکھنا چھوڑ دیا۔ سگریٹ پینے والوں نے سگریٹ پھینک دیئے۔ ہر طرف سنجیدہ ماحول ہو گیا۔ سفارش کرنے کے لیے جو لوگ آئے تھے آہستہ آہستہ جانے لگے اور نیرج تو بُت بن گیا کیونکہ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ جج صاحب کی موجودگی میں اب کچھ بھی وہ غلط نہیں نہ کر سکتا ہے، نہ کوئی سفارش سن سکتا ہے اور نہ کسی کی مدد کر سکتا ہے۔ حالانکہ گُرداس مل نے اُسے آنکھوں میں کچھ کہنے کی کوشش کی مگر نیرج اپنی آنکھوں پر مکمل کنٹرول کر چکا تھا کہ وہ کوئی اِشارہ نہ دیکھیں۔ اپنے کانوں پر اِتنا اثر ڈال چکا تھا کہ وہ کوئی بھی غلط لفظ نہ سُنیں۔ اُسے افسوس ہوا کہ اب اُسے صحیح فیصلہ کرنا پڑے گا۔ گھبرایا ہوا تھا اُسے لگا کہ تینوں فیصلے قابلیت کی بنا پر کرنے پڑیں گے اور سفارش کی گنجائش اب کہاں ہے۔

ہر کوئی پریشان تھا۔

نیرج کمار نے دھیان سے ڈانس دیکھنا شروع کیا اور بڑے ہی ڈر سے نمبر دینے لگا۔ پھر جج صاحب کی لڑکی بھی وہاں پر آ گئی۔ اُس نے بھی ڈانس کیا۔ نیرج کو معلوم تھا کہ اگر اُس نے جج صاحب کی لڑکی کی بھی طرفداری کی تو وہ اُسے نہ چھوڑیں گے کیونکہ جج نہ بھائی ہوتا ہے، نہ باپ، نہ چچا نہ تایا۔ اُسے تو سماج میں اِنصاف کرنا ہے اور کسی سے بھی بے اِنصافی ہو جائے جج برداشت نہ کر سکتا ہے۔ گُرداس مل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نیرج کمار سے کچھ کہا مگر جج صاحب کے آنے کے بعد سوچ اُلٹ ہو گئی تھی۔ اِس لئے کہ وہ کچھ نہ سمجھ سکا بلکہ سمجھنے لگا کہ اب پرانی بات نہ ہو گی 'اِنصاف کرنا ہے اور صرف اِنصاف کرنا ہے۔

مقابلہ ختم ہوا.......

نیرج کمار گپتا نتیجہ تیار کرنے کے لئے اندر چلا گیا' خفیہ طریقے سے' تا کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے۔ کوئی بھی بے اِنصافی کی گنجائش نہ رہے کیونکہ جج صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ جج صاحب ٹہلتے ٹہلتے اندر کی طرف چلے گئے۔

نیرج کمار گھبرا گیا۔ اُس کو پسینہ آ گیا۔ اُس نے سمجھا کہ شاید اُس سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ جج صاحب اور اندر چلے گئے۔ نیرج جھک کر کھڑا ہو گیا مگر جج صاحب نے اُسے صرف اِتنا کہا۔ ''میری بیٹی کا خیال رکھنا.......''

وہ بے ہوش ہو گیا۔

***

ہتھیار

''تم نے غلط کہا تھا۔'' اُس نے اُس کی طرف حیرانگی سے دیکھا۔

''کیا.......؟''

''حیرانگی سے سوال مت پوچھو، تم یہ سب پہلے سے جانتے تھے۔''

''کیا جانتا تھا میں، جو تم نہیں جانتے تھے.......؟''

''تم نے صرف گولی چلانا سکھایا۔ مگر یہ نہیں سکھایا کہ گولی سے درد کتنا ہوتا ہے اور نہ ہی یہ بتایا کہ اِنسان صرف مذہب ہی سے نہیں بلکہ اِنسانی رِشتوں میں بھی بندھا ہوا ہے اور مذہب یا مُلک نہ بھی ہو تو کوئی بات نہیں، مگر عورتیں اگر مردوں کو جنم دینا بند کر دیں تو دُنیا کو آدمؑ اور برہما بھی نہیں بچا سکتے۔'' یہ سُن کر وہ وہاں سے جانے لگا مگر وہ اُٹھا اور اُس نے راستہ روک لیا اور اُس سے اُس نے اِتنا کہا کہ........ ''تجھے یہاں سے کسی صورت میں بھی نہیں جانے دُوں گا۔ جب تک میری پوری بات نہ سنو گے۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں.......؟''

''وہ اِس لیے کہ مجھے بات کرنے کا حکم ہے بات سُننے کا نہیں۔''

''یہ حکم دینے والا کون ہے؟''

''اُسے بھی معلوم نہیں کیونکہ وہ خود بھی کسی دُوسرے سے حکم لیتا ہے۔''

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر تیز بارش شروع ہوگئی اور ایک شخص چھاتا لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر اُس نے زور سے کہا۔

''تم میری اجازت کے بغیر اندر داخل کیوں ہوئے......؟''

''اگر تمہاری اجازت کے بغیر بارش ہوسکتی ہے تو میں بھی اندر آ سکتا ہوں۔''

اُس نے فوراً جواب دیا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے۔''

''کیوں ایسا نہیں ہے......؟''

''ایسا اِس لیے نہیں ہے کیونکہ یہ میرا گھر ہے۔''

''غلط غلط.....'' اُس کے یہ لفظ سُن کر دونوں حیران ہوگئے۔ مگر اِتنی دیر میں بارش اور تیز ہوگئی۔

''غلط کیسے......؟''

''کیونکہ اِس مکان کے نیچے جو زمین ہے وہ بڑی زمین کا حصّہ ہے اور اِس مکان میں اِستعمال کیا گیا سب تعمیری سامان بھی زمین کا حصّہ ہے مگر بنایا میں نے ہے۔''

''یہ بھی غلط کیونکہ زمین کو کوئی بھی نہیں بنا سکتا۔ یہ ہمیشہ سے قائم و دائم ہے اور ایسی ہی رہے گی۔''

''تو پھر جنگ کس بات کی ہے؟ اصل میں لگتا ہے اِنسانی سوچ بٹی ہوئی ہے اور پھر یہ سب کچھ اِسی لیے ہے۔'' باہر بارش تھم گئی اور وہ شخص وہاں سے جانے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو.....؟'' اُس نے زور سے آواز دی۔

''نہیں، کہیں نہیں۔ اصل میں اب میں رُک نہیں سکتا کیونکہ میں صرف بارش کی

وجہ سے رُکا تھا مگر چونکہ بارش بند ہوگئی ہے اور میرا چلنا ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مگر وہ دونوں ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے اور دیکھتے ہی گئے۔ ''پھر بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم نے مجھے وہ سب کچھ کیوں سکھایا جو اِنسانوں کو درد دیتا ہے۔ اُس جگہ تم مجھے کیوں لے گئے جہاں آنکھیں صرف لہو دیکھنا پسند کرتی ہیں اور ہاتھ صرف خون کرنا پسند کرتے ہیں۔''

''مگر تم اِتنے پریشان کیوں ہو؟''

''میں اِس لیے پریشان ہوں کہ جب میں نے گولیاں چلائیں تو لوگ ایک دُوسرے کی مرہم پٹی کرنے لگے اور اُنہیں ہسپتال لے جانے لگے۔ سب ایک دُوسرے کے درد میں شامل ہوگئے اور میں بدنصیب اُس وقت درد دینے والوں تھا' زخم پہنچانے والوں میں تھا۔''

تبھی ایک اور خوبصورت نوجوان وہاں پر آ گیا۔ اُس نے پہلے والے شخص سے آتے ہی کہا۔

''جناب میں تیار ہو گیا ہوں۔''

''تم کہاں جا رہے ہو.........؟''

''وہیں' جہاں سے تم آئے ہو۔''

''جانے سے پہلے اِتنا یاد رکھو کہ جب گولی چلتی ہے تو اِنسان زخمی ہوتا ہے' چاہے اُس کا کوئی بھی مُلک ہو' چاہے اُس کا کوئی بھی مذہب ہو۔''

اِتنی دیر میں تیسرا شخص وہاں پر آ گیا۔

''ٹھیک کہتے ہو۔ میں اِس کی شہادت ہوں۔''

''کیسے.....؟''

''کیونکہ میری ہی گولی سے میرے مُلک کا آدمی مارا گیا تھا۔''

''وہ کیسے........؟''

''غلطی سے بندوق کی بیرل اِدھر مڑ گئی تھی۔''

''مگر......مگر ایسی گولیاں کیوں نہ بنائی جائیں جو تمہارے مُلک کے لوگوں کو نہ ماریں۔''

''ایسا ممکن نہ ہے کیونکہ گولی کا بھی کوئی مُلک نہیں ہے۔''

''مجھے سمجھ نہیں آتی جب گولی کا بھی کوئی مُلک نہ ہے، موت کا بھی مُلک نہ ہے تو پھر اِنسان نے یہ مُلک اور سرحدیں کیوں بنائی ہیں۔'' یہ سُن کر تیسرا شخص بول پڑا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایسی گولی بنائی جائے جو ہم مذہب کو نہ لگے۔''

''نہیں یہ بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ گولی کا کوئی مُلک نہ ہے۔ اور پھر سچائی آخر یہ بھی ظاہر ہوگئی ہے کہ گولی کا کوئی مذہب نہ ہے۔''

''مگر تم مجھے پھر خون کی ٹریننگ کیوں دے کر پار بھیجتے ہو اور اب کی بار تم نے دُوسرا شخص تیار کرلیا ہے۔''

وہ ابھی اِن باتوں میں مشغول ہی تھے کہ وہ شخص جو باہر سے آیا تھا کہنے لگا۔

''سچائی یہ ہے کہ صرف زبانوں کے جھگڑے ہیں اور سچائی یہ بھی ہے کہ اگر لفظوں کو پڑھنے والا کوئی نہ ہو تو صرف کاغذ پر پڑنے والے دھبے ہیں۔''

''تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ہتھیار پھینک کر ہسپتال بنانے چاہئیں۔''

''جب لوگ زخمی نہ ہوں گے تو پھر ہسپتال بنانے کا فائدہ کیا ہے؟''

''نہیں، زخمی ہونا اِنسان کا مقدر ہے۔ گرنا، حادثے ہونا، یہ پہلے ہی دِن سے اِنسان کی قسمت میں لکھا ہوا ہے۔''

''نہیں تمہیں اب پار جانا ہی پڑے گا۔''

''کیوں....؟''

''کیونکہ میں نے ہی تمہیں اِنسانوں کو مارنے کی ٹریننگ دی تھی اور......اور اب مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ اگر تمہیں مارنے کے لیے کوئی نہیں ملا تو تم میرا ہی قتل

کر دو گے۔'' وہ سب حیران ہو گئے اور پھر ایک دُوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

اور ایک طرف لڑکی گھنگھرو بجا رہی تھی۔ وہ سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''اب اِن ہتھیاروں کا کیا ہوگا؟ اگر تم نے چلانے سے اِنکار کر دیا تو عین ممکن ہے یہ خود بخود چل پڑیں۔ آؤ بھاگ جائیں۔''

دُور چڑیاں چہچہانے لگیں گویا کہہ رہی ہوں تم ہی اِس زمین کے باسی نہ ہو بلکہ اِس زمین پر جانور بھی رہتے ہیں جو ہتھیار نہ بناتے ہیں۔ وہ سوچ میں بُڑ بڑائے۔ تیزی سے بجنے والے گھنگھروؤں کی آواز کے ساتھ ہوا کی آواز آنے لگی، جو اُنھیں اچھی لگنے لگی۔ ''دیکھو دُھوپ کتنی خوبصورت ہے۔ آؤ دُھوپ دیکھیں۔ آؤ باہر بیٹھ کر دُھوپ کا مزہ لیں۔'' دُوسرے شخص نے کہا۔

''صرف دُھوپ ہی کیوں......؟ ہوا کا بھی مزہ ہے پھر دُھواں پھیلا کر ہم دُھوپ کو میلا کیوں کرتے ہیں؟''

''اصل میں دُھوئیں سے ہمارے اپنے ہی چہرے کالے ہوتے ہیں کیونکہ سورج بہت دُور ہے اور اُس پر دُھوئیں کا اثر ہو ہی نہیں سکتا۔''

''صرف دُھوپ کو میلا ہی نہیں کرتے ہوا میں گھٹن بڑھا کر اِس کو قید کرنے کی کوشش کرتے ہیں......''

''آؤ گھنگھروؤں کی آوازیں سُنیں۔''

''ارے یہ کیا ہمیں چیخوں کی آواز بھی سُنائی دے رہی ہے۔''

''مگر یہ تو سرحد کے اُس طرف ہے۔''

''آواز کی کوئی سرحد نہ ہے سچائی یہ ہے کہ ہوا کی کوئی سرحد نہیں ہے۔''

''اب اِن ہتھیاروں کا کیا کِیا جائے؟''

''ایک بات کرتے ہیں......'' پہلے نے کہا۔

''......ہم درختوں کو پانی دیتے ہیں اور پھول اُگاتے ہیں اور آنے والی

نسل کو ہتھیار چلانے کی ٹریننگ نہ دے کر اُسے پھول اُگانے کا طریقہ بتاتے ہیں۔''

وہ یہ سب سُن کر خوش ہو گئے۔

''مگر اِن ہتھیاروں کا کیا کِیا جائے؟'' اِس سوال سے وہ کافی پریشان ہوئے۔

''اب تباہی جو ہم نے بوئی ہے اُس کی فصل تو کاٹنی ہی پڑے گی۔''

''ہتھیاروں کو پڑا رہنے دو۔ آنے والی نسلیں اِنہیں چلانا بھول جائیں گی اور وقت بارُود کو ضائع کر دے گا۔''

وہ ایک دُوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور بول اُٹھے۔

''گھنگھرؤں میں گولیوں کی آوازیں جذب کرنے کی طاقت موجود ہے۔''

***

اُس نے سوچا

وہ ایک درد کو اپنے ساتھ لئے جیتا اور درد کو ہی وہ اپنی سب سے بڑی دولت سمجھتا۔ پھولوں کی حفاظت کرتا، درختوں کے ساتھ لپٹ کر روتا اور اُسے ہر چیز کے اندر ایک عجیب سی کشش محسوس ہوتی تھی۔ درد کی بھی عجیب کہانی ہے، یہ جہاں رہتا ہے، دُوسروں کے لئے دوا بن جاتا ہے۔ یہ درد ہی جوگیوں اور عاشقوں کی زِندگی ہے۔ درخت کی ٹہنیوں کو پتیوں کے گرنے کا درد، زمین کو درختوں کے اُجڑنے کا درد، چاند کو زمین سے بچھڑنے کا درد، زمین کو سورج سے بچھڑنے کا درد اور یہ درد ہی دوا ہے۔ یہی عشق ہے اور اِس میں سب کچھ قائم ہے۔ اِسی وجہ سے چہرے حسین لگتے ہیں۔ پھول خوبصورت لگتے ہیں۔ درد ہر چیز کے اندر بسا ہے۔ پھول کی پتیوں نے اُس سے الگ ہونا ہوتا ہے۔ سمندر کے پانی کو بھاپ بن کر آسمان میں اُڑنا ہوتا ہے۔ نفرت نام کی کوئی چیز اُس کے دِل کے اندر نہیں رہ سکتی ہے اور وہ صرف اب درد کے سہارے ہی زِندہ ہے۔ ہر پیار کرنے والے کی مدد کرتا ہے۔

اصل میں گوبند بچپن سے ہی گوپالنی کو چاہتا تھا۔ وہ سلسلہ در سلسلہ آگے بڑھنے لگا۔ اُنہوں نے قلم بدلے، کتابیں بدلیں۔ ایک دُوسرے کی آنکھوں میں اپنے

آپ کو دیکھا اور اپنا رِشتہ وقت سے جوڑنے کی کوشش کی۔ یہ بھول کر کہ وقت بے وفا ہوتا ہے......اور پھر اُنھوں نے محسوس کیا کہ اِنسان ہر یُگ میں محبت ایک ہی طریقے سے کرتا ہے۔ اُس کا کوئی بھی ملک ہو اور کوئی بھی مذہب ہو مگر محبت ایک ہی طریقہ سے ہوتی ہے۔

وقت اور آگے بڑھا۔ وہ کالج میں چلے گئے۔ گوپالنی سائنس کی طالب علم تھی۔ اُسے سائنس بہت پسند تھی مگر گوبند تاریخ کے مضمون میں ماہر تھا۔ یہاں تک کی تاریخ میں اُس نے پوزیشن بھی لی تھی۔ مگر گوپالنی کا ساتھ نبھانے کے لئے اور ہر روز اُسے دیکھنے کے لئے اُس نے تاریخ کا مضمون چھوڑ کر سائنس کا مضمون لیا۔

گوبند کے اندر کرکٹ کا ایک بہت بڑا کھلاڑی بننے کی صلاحیت تھی مگر اُس کی یہ بدقسمتی تھی کہ گوپالنی کو بیڈمنٹن پسند تھا۔ وہ بیڈمنٹن کھیلتی تھی اور وہ بھی ساتھ کے لڑکوں کے ساتھ۔ اب گوبند نے بھی کرکٹ چھوڑ کر بیڈمنٹن کھیلنا شروع کر دیا۔ مگر وہ بیڈمنٹن نہ کھیل سکا۔ یہاں ہار ہی اُس کا مقدر تھی اور وہ ہارنے لگا۔ وہ کبھی جیت نہ سکا۔ صرف سائنس لینے کی وجہ سے ہی وہ اچھے نمبر نہ لے سکا۔ اُس برس صرف پاس ہوا مگر نہ جانے کیوں وہ گوپالنی کو حد سے زیادہ چاہتا تھا۔

گوپالنی ایک امیر باپ کی بیٹی تھی اور گوبند ایک غریب باپ کا بیٹا۔ ایک دن گوبند نے پوچھا......

''لوگ امیر کیسے بنتے ہیں......؟''

''....جب دُوسرے کے گھروں کے اندر کپڑے کم ہونے کی وجہ سے عورتوں کے جسم ننگے ہو جاتے ہیں تو کچھ لوگ خود بخود ہی امیر بن جاتے ہیں......'' گوبند کے باپ نے جواباً کہا۔

گوبند یہ سُن کر امیر بننے کی خواہش نہیں کر سکا۔ اُدھر گوپالنی سے اُس کا پیار روز بروز بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا اور پیار کی تڑپ بھی کسی صورت میں اُس کو چین سے نہ

بیٹھنے دیتی تھی۔ اِس تڑپ کو مٹانے کے لئے وہ ہر روز گندے پانیوں کو صاف کرتا، ہر خالی جگہ میں پھول لگانے کی کوشش کرتا۔ اپنے سائیکل پر اسکول کے بچوں کو چھوڑنے جاتا اور بچوں کو حساب کے سوال بھی سمجھاتا۔ وہ گھر گھر جاتا اور مریضوں کو ہسپتال پہنچاتا۔ ایک دن محلے کی بوڑھی نے کہا۔

''گوبند کیا کر رہا ہے.......؟''

''چچی پڑھ رہا ہوں۔''

''خاک پڑھ رہا ہے۔ تین دن سے میرے نل میں پانی نہیں آیا ہے۔'' گوبند بھاگا اور نلکے والے کے پاس چلا گیا۔

وہ کسی کی بجلی ٹھیک کروا رہا ہے تو کبھی کسی کے بچے کو کھِلا رہا ہے۔ اور کبھی کسی مریض کو دوائی دے رہا ہے۔ پیار کی تڑپ بجھانے کا طریقہ خوب نکالا تھا گوبند نے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی کام اُس کے آگے محلے کی بوڑھیاں کرنے کو رکھ دیتیں اور وہ کرتا، بلکہ خوشی سے کرتا۔ وہ ہر وقت گوپالنی سے پیار کرتا تھا۔ ایک پیار، جو کتابوں میں نہیں لکھا جاسکتا اور کسی کو سُنایا بھی نہیں جاسکتا ہے۔ جو ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اُس کا نہ کوئی ماضی ہے اور نہ ہی کوئی مستقبل ہے۔

پھر کیا ہوا کہ گوپالنی کی شادی روشن سے ہوگئی۔ دُھوم دھام سے یہ شادی ہوگئی اور گوبند نے اُس میں حصہ بھی لیا۔ لوگوں نے بارات کو دیکھا۔ گوبند نے بارات کا سواگت کیا۔ روشن بھی ایک امیر ماں باپ کا بیٹا ہے۔ روشن اور گوپالنی کی نئی زِندگی شروع ہوگئی۔ خوشی اور محبت کی زندگی۔ کبھی گوپالنی اپنے میکے گھر میں آئی اور جوں ہی اُن دونوں کو گوبند ملتا ہے، گوپالنی ایک دم بول پڑتی ہے......

''یہ گوبند ہے...... مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ میرے لئے اِس نے کرکٹ چھوڑا اور سائنس کا مضمون لیا اور کم نمبر آئے۔ اِس نے میرے لئے اپنا سب کچھ قربان کردیا.......'' گوپالنی یہ سب کچھ اِس ادا سے کہتی جیسے وہ جنگ جیت گئی ہو یا جیسے دُنیا

اُسی کے لئے بنی ہو اور یہ فیصلہ بھی اُسی نے کرنا ہے کہ وہ کس سے محبت کرے اور کس سے نہ کرے۔ یہ کہہ کر گوپالنی، روشن کو لے کر وہاں سے چلی جاتی اور گوبند دُور تک اُنہیں دیکھتا رہتا اور دیکھتا ہی جاتا۔ ایک بار روشن گوپالنی کو لے کر بیرونِ ملک چلا گیا اور کئی برس تک وہاں رہا۔ اِدھر گوبند خوب کام کرتا رہا، لوگوں کی خدمت کرتا رہا، مندر میں پوجا کرتا رہا۔ گوپالنی سے بچھڑنے کا غم اُس کے دِل میں قائم رہا۔ اُس کی بڑی خواہش تھی کہ گوپالنی اُسے مل جاتی۔ محبت نے اُس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا جلال قائم کیا تھا۔ ساری بستی گوبند کو پسند کرتی تھی۔

وقت آگے بڑھ گیا۔ اب گوبند کا گھر، گھر نہیں بلکہ ایک آشرم ہے۔ اب وہ دُوسروں کو لوگوں کی خدمت کرنے کے طریقے سکھاتا ہے۔ جو بھی بچہ یتیم ہو جائے وہ وہاں آ جاتا ہے۔ جس عورت کا کوئی گھر نہ ہو وہ گوبند کے گھر آ جاتی ہے۔ اِس طرح سے خدمت خلق کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم ہے۔ کئی برسوں کے بعد گوپالنی اور روشن واپس آئے اور سیدھے گوبند کے آشرم میں چلے گئے۔ وہاں گوپالنی نے اپنی تصویر دیکھی۔ اُسے اچھا لگا کہ یہ تصویر گوبند کے دِل کے اندر بھی بسی ہوئی ہے۔ وہ جوں ہی گوبند کے پاس گئے، اُس نے سوچا "گوپالنی کو نہ پا کر اُس نے گوپالنی کو سنبھال کر رکھا ہے۔ وہ آج بھی خوبصورت ہے جس حالت میں اُس نے اُسے چھوڑا تھا۔ وہ اگر اُسے مل جاتی تو وہ اُسے کبھی بھی نہ سنبھال سکتا تھا۔ وہ بوڑھی ہو گئی ہوتی۔ اُس کے چہرے پر جھریاں ہوتیں۔ اچھا ہوا اُس نے اُسے کھو دیا تھا۔ اصل میں اِنسان دُنیا کی نظر میں جب کچھ کھو رہا ہوتا ہے تو اُس وقت وہ کچھ حاصل بھی کر رہا ہوتا ہے اور جب حاصل کر رہا ہوتا ہے تو کچھ کھو رہا ہوتا ہے۔"

اُس نے سوچا کہ اُس نے گوپالنی کو کھو کر ہی اُسے پایا ہے۔

***

گُلفیاں

دھنیا اپنی دونوں لڑکیوں اور بیوی کے ساتھ مُلزم کی طرح کھڑا ہے، حالانکہ یہ بھی سچ ہے کہ اُس نے کوئی جُرم نہ کیا ہے۔ پھر دھنیا جرم کرتا بھی کیا کیونکہ دھنیا تو گُلفیاں بیچتا ہے۔ صبح اُٹھتا ہے، پہلے پانی لاتا ہے پھر دُودھ اور پھر گُلفیاں بنا کر مشین میں رکھتا ہے اور وہ کوئی بڑا فیکٹری والا تو ہے نہیں کہ ہلدی میں اینٹوں کی ملاوٹ کرے یا اُس نے کوئی الیکشن تو لڑنا نہیں کہ وہ تیل کا بیوپاری ہو اور اُس میں چربی کی ملاوٹ کرے۔ اُس کے لڑکے لڑکیاں ڈاکٹر تو ہیں نہیں کہ ملاوٹ سے اُن کا فائدہ ہو، کیونکہ ملاوٹ سے ہی بیماریاں بڑھتی ہیں اور ڈاکٹروں کا کام چلتا ہے۔ ملاوٹ ہوتی ہے اِس لئے لوگ روپے دے کر ڈاکٹر بنتے ہیں۔ ایک جُرم دوسرے جُرم کو مضبوط کرتا ہے۔ ایک جُرم کا دُوسرے جُرم کے ساتھ ایک نہ ختم ہونے والا رِشتہ ہے۔

بڑی لڑکی پر، جو جوانی کی دہلیز پر ہے، بہاری کے لڑکے جگّو کی نظر ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نظروں سے اُسے چبانا چاہتا ہے اور کپڑے اُتارنے کا اِنتظار کرنے کا بھی

اُس کے پاس وقت نہ ہے۔ دُوسری لڑکی پر بابو مٹھائی والے کے لڑکے بسنت کی نظر ہے، جو سانپ کی طرح اُس کے جسم پر رینگنا چاہتا ہے اور اُس کے انگ انگ کو ڈسنا چاہتا ہے۔ وہ لڑکی ابھی لڑکپن کو چھوڑ کر آگے بڑھنے ہی والی ہے۔ اُس کی بیوی پر گلو پان والے کی نظر ہے جو پان کی طرح کھا کر اُسے چبانا چاہتا ہے۔ اصل میں سیاست دانوں کی بیویاں گلو پان والے ہی سے پان لیتی ہیں، جس کی وجہ سے گلو پان والے کی کافی اہمیت ہے۔ پارٹی کا ٹکٹ لینے والے، ٹرانسفر کروانے والے بھی اُس کے گاہک ہیں۔ گلو پان والا جب تھوکتا ہے تو لگتا ہے کہ زمین کو گالی دے رہا ہو اور پولیس آفیسر و سیاسی لیڈر اُس کے کہنے پر کام کرتے ہیں۔ پان خریدنے کے بہانے اُس کی دوکان پر آتے ہیں اور رشوت کے روپے بھی لئے جاتے ہیں۔

دھنیا اُٹھ کر صبح کلفیاں بناتا۔ صبح چار بجے اُٹھتا، اُس کی ایک لڑکی پانی لاتی، دُوسری دُودھ اور اُس کی بیوی مشین پر بیٹھ کر کلفیاں بناتی۔ یہ مشین کافی پُرانی ہے۔ اِس مشین کی بھی ایک کہانی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مشین پُرانی ہے اور پُرانی مشین کو خریدتے ہوئے دھنیے کی بہن پُرانی ہوگئی تھی اور اُس کی شادی نہ ہوسکی تھی اور اِتنی پُرانی کہ سماج کے آنگن سے باہر پھینک دی گئی، پُرانی ہوگئی تھی۔

محلّے کے لوگوں نے اِس مشین کے متعلق کئی باتیں کی تھیں۔ کئیوں نے کہا یہ مشین نہیں ہے بلکہ عزت کا سودا ہے۔ مگر اُن کی روزی روٹی یہ مشین تھی۔ وہ اِس مشین کے سہارے ہی زندہ تھے۔ دھنیے کے ہاتھوں میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ اُس کی کُلفیوں کا مزہ ہی الگ تھا۔ حالانکہ ایم. ایل. اے کے لڑکے نے دھنیے سے پوچھا تھا مگر اُسے کُلفیاں بنانے سے ہی کہاں فرصت تھی جو وہ اُن باتوں کا جواب دیتا۔

ایم. ایل. اے کا لڑکا آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ بھی پوچھتا کہ تمہاری لڑکیوں کے اندر اِتنا حُسن کہاں سے آیا ہے۔ دھنیا بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیتا کہ اگر میری لڑکیوں کی طرف بُری نظر سے دیکھا تو میں تمہاری آنکھیں نکال دُوں گا اور

مشین ہتھیار بن جائے گی اور اِس پرانی مشین میں اِتنی طاقت آجائے گی کہ تمہاری سیکورٹی والوں کے ہتھیار بیکار ہوجائیں گے اور تمام گُلفیاں تمہارے جسم پر ایسی خراشیں ڈالیں گی کہ تمہارا باپ بھی نہ پہچان سکے گا۔

اُس نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ یہ مت سوچنا کہ میرے ہاتھ گلفیاں بنانے میں مصروف ہیں تو میں اپنی لڑکی کی حفاظت نہیں کرسکتا ہوں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور چلتا گیا۔

گُلفیوں کی کہانیاں بھی اِنسانی رِشتوں کی طرح ہی ہے جیسے گُلفیاں وقت پر پگھل جاتی ہیں، اُسی طرح اِنسانی رِشتے بھی ضرورت کی دُھوپ میں ختم ہوجاتے ہیں۔

سب سے گرم دن آنے والا تھا۔ اُس دن خوب گُلفیاں بِکنی تھیں۔ پہلی شام سے تیاری شروع کردی گئی۔ اصل میں دھنیے کی گُلفیوں کی ریڑھی کی ایک خاص اہمیت بھی تھی۔ کالج کے لڑکے ولڑکیاں وہاں پر آتے اور گُلفیاں کھانے کے بہانے ایک دُوسرے سے تعلقات بھی بنالیتے۔ جس طرح گُلفی گرمی میں پگھل جاتی ہے اُسی طریقے سے جسم کی گرمی سے خواہشوں کی برف پگھلنے لگتی ہے۔ مگر دھنیا زور سے کہتا۔

''بابو جلدی کرو ساتھ والے اسکول میں بھی چھٹی ہوگئی ہے۔''

دھنیے کی گُلفیاں رنگ برنگی بھی ہوتی ہیں۔ گلابی رنگ کی، پیلی رنگ کی، نیلی رنگ کی، اور گُلفیوں کی اِس ریڑھی پر محبت کا کھیل ایک عجیب وغریب طریقے سے کھیلا جاتا ہے۔ لڑکے ولڑکیاں ایک دُوسرے کو پسند آنے والے کپڑے پہنتے اور پھر محبت کا یہ کھیل آنکھوں، رنگوں وگُلفیوں کے ذریعے کھیلا جاتا۔ پیلے کپڑے پہننے والی لڑکیاں سُرخ رنگ کی گُلفی کھاتیں اور سفید کپڑے پہننے والی لڑکیاں سنگتری رنگ کی گُلفیاں کھاتیں اور کبھی کبھی وہ لوگ یہ گُلفیاں ایک دُوسرے کے منہ میں ہی ڈالتے۔ مگر دھنیا اُس سے صاف کہتا ہے کہ گُلفیوں کا کھیل کھیلو، رنگوں کا کھیل کھیلو، آنکھوں کا کھیل کھیلو مگر جسموں کا کھیل نہ کھیلنا۔

اُس روز دھنیے نے اندازہ لگالیا تھا کہ کل خوب گُلفیاں بکیں گی کیوں کہ گرمی

بہت تھی۔ اِمتحان بھی ختم ہو چکے تھے۔ اِس لئے لڑکے لڑکیوں نے آنا تھا۔ پولیس کے سپاہی بھی گرمی سے تنگ تھے اور پھر کوئی آفیسر تو وہاں تھے نہیں کہ ہزاروں روپے نکلتے کیونکہ صرف بڑے آفیسروں کی بیویاں ہی اپنے خاوندوں کی اپنی مرضی سے گلو پان والے کے ذائقے لگواتیں تھیں۔ وہ تو غریب سپاہی تھے جن کی رشوت صرف ایک یا دو کُلفیاں تھیں اور پھر اگر دھنیا زیادہ دیتا تو کچھ کُلفیوں کو وہ اپنے گھر میں بھی لے جاتے۔ اُنہیں بھی اُمید تھی کہ کل دھنیے کی کُلفیاں خوب بکیں گی اور وہ سپاہی اپنی نوجوان بیویوں کو کہہ کر آتے تھے کل اُنہیں بھی کُلفیاں کھلائیں گے۔ دھنیا ایک روپیہ نوّے پیسوں میں کُلفی بیچتا، مگر چونکہ اُسے پولیس والوں کو رِشوت دینی ہوتی ہے اِس لئے وہ بھی گاہکوں کو دس پیسے واپس نہ دیتا۔ کبھی پانچ پیسے دے دیتا۔ تھوڑی سی آمدنی، تھوڑی سی رشوت، تھوڑی سی بے ایمانی۔ بس اِسی کے سہارے یہ سارا کاروبار چلا رہا تھا۔

دھنیا اپنی ریڑھی کو خوب سجاتا۔ پہلے اُس کی پوجا کرتا، پھر دُھوپ جلاتا، پھر بھگوان کی تصویر کے آگے سب گھر والے سر جھکاتے کیونکہ یہی اُن کی روزی ہے۔ اُن سب کا یہ ہی ماننا ہے۔ دھنیے اور اُس کے گھر والوں کے مطابق اگر دُنیا میں کوئی سب سے اچھی چیز ہے تو اُس کی ریڑھی ہے اور اس کی آتما تو مشین ہے جو امر ہے، جو مر نہ سکتی ہے۔

اِس اُمید پر کہ کل خوب دُھوپ ہوگی، دھنیے کی بڑی لڑکی بازار گئی اور ایک دوپٹہ بہاری کی دوکان سے خرید کر لے آئی اور کہا کہ پیسے کل دُوں گی۔ بہاری نے اِنکار نہ کیا۔ اصل میں وہ پیلے رنگ کے دوپٹے کو اپنے سر پر رکھ کر رنگ برنگیاں کُلفیاں بیچنا چاہتی تھی۔ پھر اُس کے بعد دُوسری لڑکی کو مٹھائی کھانے کا شوق تھا۔ وہ مٹھائی والے کے پاس گئی اور بابو مٹھائی والے سے ایک ڈبہ لایا اور خوب مٹھائی کھانے لگی۔ وہ کُلفیاں بھی بناتی اور مٹھائی بھی کھاتی اور اپنی سہیلیوں کو بھی کھلاتی۔ اُس کی بیوی نے پان لائے اور وہ بھی اُدھار، مست ہو کر پان کھا کھا کر وہ کُلفیاں بنانے لگیں۔ صبح سب نے اکٹھے بھگوان کے آگے سر جھکایا، پھر ہاتھ جوڑے، پورا جھک کر لیٹ کر دُعا کی کہ

آج.........موسم گرم رہنا چاہئے۔

سورج صبح سے ہی کافی تیز تھا۔آسمان پر بادلوں کا نشان تک نہ تھا۔وہ آئے اور ریڑھی پر کُلفیاں لگانے لگے۔دھنیے نے فیصلہ کیا کہ وہ کُلفیاں سجائے گا' لڑکیاں لاتی رہیں گی اور اُس کی بیوی کُلفیوں کو تیار کرتی رہے گی۔

دُھوپ تیز تھی۔لگتا تھا کہ قدرت اُن پر مہربان ہے' مگر جوں ہی اُنہوں نے ریڑھی لگانے کی کوشش کی' ایک پولیس والے نے اُنہیں روک دیا.......

''کیوں ایسا کیوں.........؟''

''کیونکہ آج وزیرِاعظم کا دورہ ہے۔''

''مگر کل ہمیں نہ بتایا گیا۔''

''سیکورٹی ریزن کی وجہ سے رُوٹ بدل گیا ہے۔''

دھنیا پریشان ہوگیا۔دُھوپ تیز ہوگئی اور اُسے لگا کہ بھگوان نے اُس کی دُعا قبول کرلی ہے۔مگر بدقسمتی سے اِنسان پر اُس کا کوئی کنٹرول نہ تھا۔آج وہ پولیس والے نہ تھے بلکہ دُوسرے پولیس والے تھے۔

سب سیدھے کھڑے تھے' کوئی حل نہ سکتا تھا۔دُھوپ اور تیز ہوئی۔دھنیے کی کُلفیاں پگھلنے لگیں اور پگھلتی گئیں۔سارا مال بہہ گیا۔چونکہ پولیس والوں نے ہلنے کی اجازت نہ دی۔دھنیے کے سامنے اُس کی دُنیا لُٹ رہی تھی مگر وہ کچھ نہ کرسکتا تھا۔دُھوپ اور تیز ہوگئی۔کُلفیاں اور پگھلنے لگیں۔

شام ہوگئی۔دھنیا کی دُنیا تباہ ہوگئی مگر وزیرِاعظم کا قافلہ وہاں سے نہ گزرا۔

دھنیے نے پوچھا تو تھکے ہوئے سپاہی نے جواب دیا..... ''سیکورٹی ریزن کی وجہ سے پھر راستہ بدل دیا گیا تھا........''

پردھان منتری کا دورہ کامیاب تھا۔

''اب وہ ضرور راج دُوت بنے گا۔'' ایک شخص نے کہا۔

''پردھان منتری کی تقریریں نے ٹی.وی. پر سُنی۔''

''میں نے بھی.........''

''اُن کو ایک ڈِگری دی گئی۔''

''مگر اُنہیں اب کیا بننا ہے.......؟''

''.......نہیں ڈگری دینے والوں کو.....اب اُس کے تعلقات سیدھے قائم ہو گئے ہیں۔''

اِدھر کلفیاں پگھل رہی ہیں.........

اور دھنیے کی بڑی لڑکی پر بہاری کے لڑکے کی نظر ہے' دُوسری بیٹی پر بابو مٹھائی والے کے بیٹے کی اور بیوی پر پان والے کی نظر ہے۔

اُدھر پردھان منتری کا جہاز آسمان پر اُڑ رہا ہے۔

***

عشق کی ہار

جب بھی کوئی محبت کے میدان میں ہارتا ہےتو چناب کا پانی ضرور اُچھلتا ہے۔گویا اُسے کہتا ہو کہ اِسی میں تیری جیت ہے۔سوہنی ماہیوال سے لے کر آج تک یہ قِصّہ چل رہا ہے۔

دُوسرے گاؤں سے فُٹ بال کی ٹیم اِس گاؤں میں آئی تھی۔نوجوان اور خوبصورت لڑکے وردی پہن کر میدان میں جا رہے تھے اور دُوسرے گاؤں سے میچ دیکھنے کے لئے لوگ بھی وہاں پر آچکے تھے۔اور پھر اس گاؤں کی ٹیم بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ بھی تیار ہو کر میدان میں جا رہی تھی۔ایک ٹیم کی اگوائی تیرتھ کر رہا تھا اور دُوسری کی نامدیو۔لگتا تھا کہ سارا ماحول بھرے ہوئے فُٹ بال کی طرح ہو گیا ہو اور سب لوگ کھیلنے کی تیاری کر رہے ہوں اور جیتنے کی خوشی کی ہَوا اِس میں بھرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔بات اور آگے بڑھی۔دونوں ٹیمیں آمنے سامنے تھیں۔میدان اور فُٹ بال بھی۔تیرتھ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔جب پیدا ہوا تو یوں رویا گویا فٹ بال مانگ رہا ہو۔جب گھسیٹی کرنے لگا تو لگا کہ فُٹ بال کے پیچھے جا رہا ہو اور جو اُسے اُس

کے مطابق کھلو نے نہ دیتا' اُسے یوں دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو'' کیوں فول کرتے ہیں؟''

تیرتھ غریب تھا۔ باپ بچپن میں ہی مر گیا تھا۔ جب محلے کا کوئی لڑکا نئے کپڑے پہنتا اور تیرتھ کے پاس نہ ہوتے تو عورتوں کے کپڑوں سے بچی ہوئی لیریں اکھٹی کرتا۔ پھر اُن کو اپنے بدن پر لگاتا اور ہاتھ سے ایک چھوٹا سا گیند تیار کرتا جسے وہ فُٹ بال کا نام دیتا۔ جب اسکول کے لڑکے پکنک پر جاتے اور اُس کے پاس پیسے نہ ہوتے تو لگتا جیسے لوگ اُس پر گول مار رہے ہوں۔

اُن کی آنکھوں نے خوب جشن کیا اور ایک نیا سلسلہ ظہور میں ضرور آیا مگر زیادہ دیر چل نہ سکا کیونکہ یہ سب ایک ہی رات کے لئے تھا۔ دُوسرے دِن کے بعد وہ رات نہ آنی تھی۔ مُنیشا خاموش تھی۔ چُپ ہوگئی۔ اُسے لگا کہ دُوسرے گاؤں کے کھیت اُس کے گاؤں کے کھیتوں کو بُلا رہے ہیں' درخت آپس میں مل کر پتّوں کا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں' پتّوں کا کھیل۔ جب ہَوا چلتی ہے تو پتے ہلتے ہیں۔ لگتا ہے کھیل کھیل رہے ہوں۔ ایک دُوسرے سے ملنے کی آرزو کر رہے ہوں کیونکہ ایک ہی درخت کی ایک اور ٹہنی کے ہوتے ہوئے بھی آپس میں ٹکرا سکتے ہیں' مِل نہیں سکتے۔ کیونکہ جدائی اُن کا مقدر ہے۔ اُسے لگا کہ اُس گاؤں کا میدان اُس کے گاؤں کی فُٹ بال ٹیم کو اپنے پاس بلا رہا ہو۔ اُس کی آنکھیں اُس پگڈنڈی کا راستہ دیکھنے لگیں جو دونوں گاؤں کو آپس میں ملاتی تھیں۔

مُنڈنوں کے بعد مُنیشا کو اپنے گاؤں واپس جانا پڑا۔ مگر نہ جانے کیوں وہ دُوسرے دِن پھر اُس گاؤں میں واپس آ گئی اور سیدھا نارائین کی دُوکان کے اندر چلی گئی۔ تیرتھ وہاں پر بیٹھا ہوا تھا۔ مُنیشا نے کپڑے دیئے۔ نارائین نے اُس کا ماپ لیا اور کپڑا لیا۔ اُسے کاٹا اور پھر تیرتھ نے لیریں اکھٹی کیں اور انہیں اپنے کمرے کی دیواروں پر سجانے کے لئے لے گیا۔ یہ سلسلہ چلتا ہی گیا۔ مُنیشا چلی گئی۔ اُس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ تیرتھ کو دیکھنے کے لئے آتی ہے۔ یہ سلسلہ آگے جاری ہو گیا۔ مُنیشا کے

پاس اپنے سلوانے کے لئے اتنے کپڑے نہ تھے۔ پھر وہ سہیلیوں کے کپڑے لانے لگی۔ نارائین کی دوکان کی رونق بڑھنے لگی۔ تیرتھ وہاں بیٹھتا اور پھر یہ سلسلہ اور آگے بڑھنے لگا۔ مُنیشا کے اُس گاؤں میں آنے کا سلسلہ چلتا رہا۔

بات آگے بڑھی۔ تیرتھ بھی جوانی کی طرف جانے لگا۔ لیریں اکھٹی کرنے کا سلسلہ جاری رہا اور جب تیرتھ سولہویں برس میں پہنچا' یہ سلسلہ کچھ اور آگے بڑھا۔ اب لیریں ہی نہیں' وہ خوبصورت لڑکیوں کے کپڑوں کی لیریں اکھٹی کرنے لگا اور اپنے دوست نارائین کی دُوکان پر بیٹھنے لگا۔ نارائین ایک درزی تھا جو صِرف عورتوں کے ہی کپڑے سیتا تھا۔ خوبصورت لڑکیوں کے بدنوں کے جب ناپ لیتا تو اُسے لگتا کہ دھُوپ ٹھنڈے سورج کے گھر جا رہی ہو۔ ایسا کرتے ہوئے وہ آنکھیں نیچی رکھتا۔ یوں ظاہر کرتا جیسے اُسے کوئی دِلچسپی نہ ہے۔ اِدھر نارائین جوان ہے' خوبصورت لڑکیاں ہر وقت اُس کی شرافت کے گُن گاتیں تاکہ اُنہیں صرف اُسی سے کپڑے سلوانے کا بہانہ مل سکے۔ سب جانتے ہیں اُس نے دوکان پر لیڈروں کی تصویریں لگائی ہوئی ہیں۔ اُدھر بوڑھے درزیوں نے فلم ایکٹرسوں کی تصویریں لگائی ہیں۔

تیرتھ شرافت کا مجسمہ بننے کی کوشش کرتا تاکہ اُس کے بیٹھنے کی وجہ سے لڑکیاں وہاں آنا نہ چھوڑ دیں اور پھر جب خواہشوں کا فُٹ بال کھیلنے کی کوشش کرتا تو اُسے زِندگی اور حالات کا ٹیڑھا میڑھا میدان ملتا۔ جس پر کھیل کر اُس کی زِندگی کے دِن زخمی ہو جاتے۔ وہ سوچتا کہ کاش وہ بھی درزی ہوتا' فُٹ بال کا پلیئر نہ ہوتا۔ جب لڑکیوں کا ناپ نارائین لکھتا تو تیرتھ کو لگتا جیسے کاغذ پر ستارے بکھیر رہا ہو۔ تیرتھ کو' گو اب کھیلنے کے لئے کہیں سے فُٹ بال مِل سکتا تھا مگر وہ لیروں کے اُس گیند کو نہیں چھوڑتا۔

پھر مُنیشا اب کی بار اپنے گاؤں کی فُٹ بال کی ٹیم کے ساتھ آئی تھی اور اُسے فُٹ بال کا میچ بھی دیکھنا تھا اور تالیاں بجا کر اپنے گاؤں کے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی بھی کرنی تھی۔ جب کھیل شروع ہوا تھا' نا جانے کیوں مُنیشا تیرتھ کے پاؤں کی طرف

دیکھتی رہی، اُس کے بدن کی خوشبو [illegible] محسوس کرتی رہی۔ لگ رہا تھا کہ کھیل تیرتھ رہا ہے مگر تھک مُنیشا رہی ہے۔ مُنیشا کا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ جونہی تیرتھ فُٹ بال کو ہٹ لگاتا، مُنیشا نہ چاہنے کے باوجود تالیاں بجاتی۔ مُنیشا کے گاؤں والوں کی نظریں اُس پر تھیں۔ پورے گاؤں کے لوگ جو یہ مقابلہ دیکھنے آئے تھے، اُسے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ نمبردار کے پاس اس بات کی شکایت ہوئی۔ اُس نے مُنیشا کے باپ کو بتا دیا کہ اُس کا حقہ پانی الگ کر دیا جائے گا۔ اُس روز بارش کی وجہ سے یہ کھیل نہ ہو سکا۔ مگر مُنیشا کے گاؤں والوں نے یہ سب دیکھ لیا تھا اور یہ اعلان کیا گیا کہ اگر مُنیشا نے دُوسرے دِن بھی دُوسرے گاؤں والوں کے حق میں تالی بجائی تو گاؤں والے زبردستی مُنیشا کی شادی نامدیو سے کر دیں گے۔ مُنیشا رات بھر پریشان رہی۔ اُس کے دِل میں تیرتھ گھومتا رہا۔ اِدھر صبح حالات اور بدل گئے۔ گاؤں کی پنچایت نے فیصلہ کیا کہ اگر اُن کی ٹیم جیتی تو نامدیو جو مانگے گا اُسے دیا جائے گا۔

کیونکہ اب یہ مقابلہ صِرف کھیلنے والوں کے درمیان نہ رہا تھا بلکہ نمبرداروں کا مقابلہ ہو گیا تھا۔ سرپنچوں کا مقابلہ ہو گیا تھا۔ مُونچھیں رکھنے والوں کی مُونچھوں کا مقابلہ ہو گیا تھا۔ شاخوں سے گِرنے والے پتے کہہ رہے تھے کہ یہ گاؤں جیتے یا دُوسرا مگر فُٹ بال کبھی نہیں جیتا۔ لوگ کھیلنے والوں کی تعریف کرتے ہیں۔ فُٹ بال نے ہمیشہ ہارنا ہوتا ہے۔ جیتنے والا بھی زور سے کِک مارتا ہے اور ہارنے والا بھی۔ اِس طریقے سے عشق نے بھی ہارنا ہوتا ہے اور چناب کا پانی بھی کہہ رہا تھا کہ مُنیشا کو ہارنا ہی ہے۔

***

سوال

لگتا ہے ہر چیز سوال پوچھ رہی ہے۔ دریا بہہ نہ رہے ہوں بلکہ سوال پوچھ رہے ہوں۔ بچّے گیند نہ اُچھال رہے ہوں بلکہ وہ لفظ اُچھال رہے ہوں جن سے سوال بنتے ہیں۔ پھر یہ سب دیکھ کر کبھی کبھی لگتا ہے کہ اِنسانی بدن جو دھرتی پر ہیں، صرف سوال ہیں اور یہ سوال اُس وقت کیئے گئے جب اِنسان کے گناہوں کا حساب رکھنے کے لئے فرشتوں کو اُس کے کاندھوں پر بٹھا دیا گیا۔

فرشتے کاندھے پر بیٹھ کر تنگ آ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ حساب رکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ تو پہلے ہی طے تھا کہ اِنسان گناہ کرے گا، پاپ کرے گا اور اِس لئے اوتاروں اور پیغمبروں کے دھرتی پر آنے کی تاریخیں پہلے ہی طے تھیں۔

اُس راجہ نے، جس کی آنکھیں رنگوں نے گرفتار کی ہوئی تھیں اور کان چیخوں کی آواز سُننے کے عادی ہو گئے تھے۔ راجہ بھی وہ تھا جس کی زبان دُوسروں کے لفظ بولتی تھی اور جس کے جیل خانے میں وہ قیدی تھے جنہوں نے دُوسروں کے جُرم کا اِقبال کیا تھا۔ اُس نے ایک سوال کیا اور کہا کہ اُس شخص کو منہ مانگا اِنعام دیا جائے گا جو میرے اس سوال کا جواب دے گا۔

''دُنیا میں سب سے اچھی زِندگی کون جیا؟'' جوابوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

''دُنیا میں سب سے اچھی زِندگی راجہ جیا۔'' مگر یہ جواب سُن کر یوں لگا کہ جیسے کوئی اُسے گالی دے رہا ہو کیونکہ راجہ اُس ترازو کے بارے میں جانتا ہے' جسے انصاف کا ترازو کہا جاتا ہے اور ہوا اِس کے مخالف ہے۔ دُھوپ اِس کے اندر بے وجہ وزن ڈالتی ہے اور بعد میں انصاف کا ترازو صحیح نہ تولنے والے کو اپاہج بنا دیا جاتا ہے' کیونکہ یہ اِنصاف بھی ترازو کا ہی ہے۔ جو ترازو میں پاپ اور پُن صحیح نہ تول سکے اُسے اپاہج کر دیا جائے۔

پھر راجہ کی زِندگی رنگین ہے۔ دلکش ہے۔ اِس لئے کہ وہ رات بھر خوبصورت لڑکیاں نچاتا رہتا ہے۔ اِسی لئے اُسے دن بھر سونا پڑتا ہے۔ پھر راجہ کے دادا کی کہانی بھی بستی کے لوگوں کو معلوم ہے۔ وہ دُوسروں کی عورتوں کے جسم نہاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ مگر ایک دن اُسے یہ خبر بھی سُننا پڑی کہ اُس کی رانی ایک گھڑ سوار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

اِس سوال کا کوئی معقول جواب اُسے نہیں مل رہا تھا۔ بلکہ بات یہاں تک بڑھ گئی کہ ہر جواب کئی اور سوال پیدا کر رہا تھا اور لوگوں کے ذہن لفظوں کے بوجھ سے تنگ آ گئے تھے کیونکہ پیدا ہوتے ہی کئی مذہب' کئی رسمیں اور کئی رواج اُن پر لاد دیئے گئے تھے۔ جن کے بوجھ سے زِندگی کے خوبصورت دن پہلے ہی ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ اُن کے پاؤں اُن کے بس میں نہیں رہے تھے۔

راجہ کی زِندگی رنگین ہے۔ مگر دیر رات تک راجہ کو سنگھاسن کی مریادا نبھانے کے لئے لڑکیوں کو نچانا پڑتا ہے۔ ایسا اِس لئے ہے کیونکہ اگر راجہ لڑکیاں نہ نچائے تو سنگھاسن ناچ پڑتا ہے اور نگری کے لوگوں کی چارپائیاں بھی چونکہ کسی نہ کسی طریقے سے سنگھاسن سے جڑی ہیں' لہٰذا سارا نظام ہی درہم برہم ہو سکتا ہے۔ ایک کی بیوی دُوسرے کے بدن سے لپٹ سکتی ہے اور تمام رِشتوں کی دُنیا ختم ہو سکتی ہے۔ سنگھاسن

رشتوں کی ضمانت ہے اور موہ کا پرچار کرتا ہے کیونکہ یہ نگری موہ کے سہارے ہی چلتی ہے۔ کیونکہ ایسا اگر نہ ہوتو ایک اپاہج بیوی کی سیوا اُس کا خوبصورت خاوند کبھی نہ کرتا اور نہ ہی ماں بچے جننے کا کشٹ لیتی۔ پھر اُسے رات کو سوتے ہوئے چلنے کی بھی عادت ہے۔ ایسا اِس لئے ہے کیونکہ دِن بھر جاگے ہوئے اُس کا چلنا منع ہے۔ کیونکہ راجہ کے چلنے پر پرجا چلنا بند کردیتی ہے۔ اِس بستی کا اصول ہی عجیب وغریب ہے۔ راجہ اگر رُکے تو پرجا چلتی ہے۔ راجہ سوئے تو پرجا جاگتی ہے۔

''اِس سوال کا جواب میرے پاس ہے۔'' اندھے شخص نے کہا۔

سب آنکھوں والوں کو جلن ہوئی کہ اگر اندھے نے جواب دے دیا تو آنکھوں والوں کی برتری ختم ہو جائے گی۔ سب سے بڑے وزیر نے کہا'' وہ کیوں؟'' اُس نے پوچھا کیونکہ اندھے کا جواب بھی اندھا ہوگا۔

''یہ غلط ہے۔'' ایک چھوٹے بچّے نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' وزیر نے پوچھا۔

''کیونکہ راجہ کی پچھلی طرف رکھی گئی اِنصاف کا ترازو پکڑنے والی مورتی کی آنکھیں بھی اندھی ہیں اور اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی ہے۔ لیکن کسی نے بھی آج تک اِس کے اِنصاف کو اندھا نہیں کہا۔'' بچّے کا جواب سُن کر راجہ پریشان ہوگیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اُس کا اِنصاف اندھا ہے۔ اِس لئے بات کو بدلنے کے لئے اُس نے اچانک کہا۔ ''ٹھیک ہے' اندھے شخص کو اپنی بات کہنے دی جائے۔'' اندھے نے جواب دیا'' جواب کوئی بھی دے سکتا ہے' اِس میں آنکھ کی روشنی کا کیا کام۔ اوتاروں پیغمبروں نے سب سے اچھی زندگی جی تھی۔'' یہ بات سُن کر بہرہ شخص چیخ پڑا۔

''جھوٹ بول رہا ہے' یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔''

''وہ کیسے....؟'' اندھے نے پوچھا۔

''اوتار یا پیغمبر' نہیں نہیں' ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ کسی کو بن باس دیا گیا' کسی کو

پانی کے بغیر مرنا پڑا تھا تو کسی کے اپنے بچوں نے گلے کاٹے۔ کسی کو سولی پر لٹکنا پڑا۔ اوتار کی زندگی تو راجہ سے بھی مشکل ہے۔''

پھر ایک جواب یہ بھی آیا کہ ویشیا سب سے اچھی زندگی جیتی ہے۔ مگر یہ جواب بھی صحیح نہیں نکلا۔ کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ وقت کے ساتھ حُسن ڈھل جاتا ہے۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح درختوں کے پتے ٹہنیوں کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور زِندگی کی پت جھڑ میں ویشیا کو اکیلے ہی زِندگی گزارنی پڑتی ہے۔ کیونکہ اس سچ کا اشتہار شہر کے اندر پھینک دیا گیا ہے کہ زندگی کی پت جھڑ کے بعد بہار کبھی نہیں آتی۔ اِس لئے ویشیا کی زِندگی بھی کوئی زِندگی ہے۔ لہٰذا یہ جواب بھی راجہ کو پسند نہیں آیا۔

مگر اُن خوبصورت عورتوں کی بات دُوسری ہے۔ راجہ جب اُن میں سے کسی ایک کی طرف دیکھتا ہے تو درباریوں کے لئے لازم ہے کہ وہ دُوسری طرف دیکھیں۔ راجہ جب کسی کو چومے تو درباری کو اُس کے متعلق بحث کرنی چاہئے' چاہے وہ کسی سپہ سالار کی بیوی یا لڑکی کیوں نہ ہو۔ اِس بات کو جاننا اُن کے لئے لازمی ہے کہ راجہ کسی کو چاہتا ہے۔ مگر کیوں چاہتا ہے؟ یہ سوچنا اُس بستی میں ایک جُرم ہے۔ جس کی سزا دینا سنگھاسن کا کام ہے۔

اِس سوال کے مختلف جواب راجہ کے سامنے پیش کئے گئے مگر کوئی معقول جواب نہ آسکا۔ کیونکہ ہر ایک کو کوئی نہ کوئی ڈر تھا۔ ہر ایک کی زِندگی میں ضرور کوئی نہ کوئی کمی تھی۔ امیر امیری سے تنگ تھے اور غریب غریبی سے۔

اُس بستی کے اندر ایک لڑکا الگ سے اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ بستی کے لوگوں نے اُسے اِس لئے الگ کیا ہوا تھا کیونکہ اُس کا کوئی باپ نہ تھا۔ چونکہ اُس کے باپ کا پتہ نہ تھا کون ہے' اِس لئے نہ کوئی اُس کی ذات اور نہ ہی کوئی اُس کا مذہب تھا۔

آج تک اُس نے اپنی ماں سے اپنے باپ کے متعلق نہ پوچھا تھا۔ بس جیتا تھا۔ مگر جینے میں اُسے کوئی مشکل نہ آئی تھی۔ وہ بستی کے عام لوگوں کی طرح ہی جی

رہا ہے۔ مگر اُسے دربار کے اندر آنے کا حُکم نہیں تھا اور نہ ہی وہ راجہ کے ساتھ بات کرسکتا تھا۔

درباریوں نے یہ حُکم بھی جاری کیا تھا کہ وہ اپنے جھوٹے برتن بھی الگ رکھے گا۔ جن پھولوں کو چھوئے گا' اُن کی خوشبو اوتاروں اور پیغمبروں تک نہیں پہنچائی جائے گی اور یہ بھی کہا گیا کہ جسے وہ دیکھے گا اُسے بھی گندہ کہا جائے گا۔

مگر راجہ اور اُس کے درباری آسمان کے بارے میں کچھ نہ کہتے تھے کیونکہ آسمان اِنسان ایک ہی نظر میں دیکھ سکتا ہے۔ مگر زمین کے بارے میں ایسا نہیں ہے اور پھر وہ اگر آسمان کے بارے میں ایسا کہتے تو روشنی کو گندہ کہنا پڑتا اور ہوا کے بارے میں بھی ایسا ہی سوچنا پڑتا۔ لہٰذا راجہ اور اُس کے درباریوں نے تمام قوانین اپنے مطابق بنائے تھے۔

مگر راجہ کو ایک لاعلاج بیماری تھی۔ وہ سوتے میں چلتا تھا۔ تمام بستی جب سوجاتی وہ رات کو اُٹھتا اور چلنا شروع کردیتا۔ ایسا صرف اُس کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ لیکن درباریوں کو اِس بات کا پتہ نہیں ہے۔ رات کو جونہی راجہ اُٹھتا ہے' رانی بھی اُس کے ساتھ چلنا شروع کردیتی ہے۔ رانی نہایت ہی خوبصورت اور جوان بھی تھی۔ راجہ کا پورا خیال رکھتی تھی۔ کیونکہ راجہ ہے تو وہ بھی رانی ہے' نہیں تو وہ بھی ایک عام عورت ہے۔

ایک دن راجا اُٹھا اور چلنے لگا۔ رانی اُس وقت ایک عام عورت کی طرح سوئی ہوئی تھی اور خواب دیکھ رہی تھی۔ اُس خواب میں وہ ایک عام لڑکے سے پیار کررہی تھی جس کے سر پر تاج نہیں تھا۔ اِس لئے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ بدن پر شاہی کپڑے نہیں تھے۔ اِس لئے وہ لڑکا بھی اُس سے پیار کررہا تھا۔ اِس لئے اُس رات کو وہ راجا کے ساتھ نہیں جاسکی۔ راجا چلتا رہا اور چلتے چلتے وہ کنویں کے پاس پہنچ گیا۔ جونہی وہ گرنے لگا لڑکے نے اُسے پکڑ لیا۔ اِس طرح سے راجہ بچ گیا۔ مگر بات یہیں ختم نہ

ہوئی۔ رات بھر راجہ اور وہ لڑکا آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر راجہ بھوکا بھی تھا۔ اُس نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ صبح پھر دربار لگا۔ سوال پوچھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا مگر راجہ کو اِس سوال کا کوئی جواب نہ مل سکا کہ کون آدمی یہاں سب سے اچھی زِندگی جیا۔

درباریوں کے ہجوم میں سے وہ لڑکا نمودار ہوا۔ سب اُسے دیکھنے لگے۔ اصل میں وہ سب کو چھو گیا تھا۔ راجہ نے اُسے پہچان لیا۔ چونکہ راجہ نے اُس کے آنے پر کوئی اعتراض نہ کیا' لہٰذا سب درباری چُپ رہے کیوں کہ درباری ہمیشہ راجہ کے مخالف ہی چلتے ہیں۔ راجہ اگر ہنسا تو درباری بھی ہنسنا شروع ہوگئے۔ راجہ اگر روئے تو درباری بھی رونا شروع کر دیتے ہیں۔ راجہ جو کرے وہ درباریوں کو بھی کرنا پڑتا ہے۔

درباری حیران ہوگئے کیونکہ راجہ نے اُس لڑکے سے بات کی جسے اُچھوت کہا جاتا تھا۔ کیونکہ اُس کے باپ کا پتہ نہ تھا اور نہ ہی اُس کی ذات اور دھرم کا کچھ پتہ تھا۔ مگر راجہ کی آنکھیں شرمندہ تھیں' زبان خود بخود لفظوں کی غلام ہوگئی تھی۔ اگر آنکھیں نہ ہوتیں تو شاید راجہ اُس لڑکے سے بات نہ کرتا۔ کیونکہ آنکھیں اِنسان سے کبھی کبھی الگ سوچتی ہیں' الگ ہو کر جینا چاہتی ہیں۔

''تو کہو......تمہارے پاس کیا جواب ہے میرے سوال کا۔'' راجہ نے لڑکے سے کہا۔

''سب سے اچھی زِندگی وہ شخص جیا جو دھرتی پر سب سے پہلے آیا۔ اُس لڑکے نے راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے......؟'' راجہ نے پوچھا۔

''کیونکہ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس نے مرنا ہے۔'' راجہ چُپ ہوگیا اور درباری پریشان ہوگئے۔

***

سونامی

وقت کے ساتھ ہی بہادر اور نیرو کی دوستی ہوگئی اور یہ بات آگے بڑھنے لگی۔
پھر ایک دِن بہادر کے چاچا کے لڑکے کا منڈن ہوا تو اُسے ایک خوبصورت قمیض مل گئی
اور نیرو کے مامے کے لڑکے کی شادی ہوئی تو اُسے ایک خوبصورت نِکر۔ اب جب
بہادر قمیض پہنتا اور نیرو اپنی نِکر تو بڑا عجیب لگتا۔ لگتا کہ خوبصورتی دو حصوں میں بٹ گئی
ہے اور زیادہ خوبصورت ہوگئی ہے۔ چونکہ قمیض اور نِکر اکھٹے رہنا چاہتے تھے' اِس لئے
اُن کی دوستی بھی مضبوط ہوگئی۔ یہ ایک عجیب سی بات تھی۔ کبھی کبھی کوئی بڑا فنکشن یعنی کہ
کسی کی سگائی ہوتی اور بہادر کو جانا ہوتا تھا تو وہ نیرو کی نِکر پہن لیتا تھا اور خود نیرو گھر میں
ننگا رہتا اور نیرو بھی کبھی ایسا ہی کرتا۔ اُنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ غریبی بھی کبھی کبھی رحمت
بن جاتی ہے اور لوگوں کے دِلوں کو جوڑتی ہے۔ غریب پڑوسی ایک دُوسرے کو سبزی
دینے کے لئے دیواریں کم اُونچی رکھتے ہیں۔ اِس وجہ سے اُن کے دِلوں کی دیواریں
کمزور ہوتی ہیں' جو ذرا سی محبت کی آہٹ سے ٹوٹ جاتی ہیں۔

بہادر کا باپ سمندر کے کنارے ایک کمپنی کا مزدور تھا۔ دو بیٹے' بڑا بہادر' چھوٹا
ساونت اور ایک بیٹی گرجہ وہاں آرام سے رہتے تھے۔ چھوٹی سی تنخواہ اور چھوٹی چھوٹی

خواہشیں اور زندگی آرام سے گزرتی تھی۔ مہینے کے پہلے دس دن کچھ بچانا، پھر اگلے دس دِنوں میں کچھ خاص بنانے پر بحث کرنا اور آخری دس دنوں میں خاص بنانے پر کھانے کا مزا لینا۔ اُسے نفرت کے بارے میں سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیتے تھے۔ بہادر کی ماں کا نتا صبح پانی لاتی، بچوں کو نہلاتی اور سکول بھیجتی۔ پھر کھانا بناتی اور اُن کا اِنتظار کرتی، پھر تھک جاتی، اُٹھتی اور شام کا کھانا بناتی، پھر تھک جاتی اور رات کو آرام سے سو جاتی۔ مگر دن بدن غربت بڑھ رہی تھی۔

نیرو کا باپ سمندر کے کنارے چائے کی دوکان کرتا تھا۔ یعنی کہ اُس نے سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ کر کے دوکان بنائی تھی۔ پولیس جب چاہتی اُس دوکان کو گرادیتی۔ وہ پھر بنالیتا اور چائے بیچتا۔ بنانا کیا ہوتا تھا، ایک ٹینٹ زمین پر باندھتا اور چائے کے کپ و پلیٹیں وہاں پر رکھ دیتا اور پھر چائے بیچنا شروع کر دیتا۔ اور مزے کی بات تو یہ تھی کہ پولیس والے جب چائے کی دوکان گرانے آتے تب بھی اُس سے چائے پیتے۔ اگر کسی دن کسی پولیس والے کا اُدھار زیادہ ہو جائے تو وہ دوکان گرادیتا اور چائے کا سارا سامان بھی پھینک دیتا جیسے کپ، پلیٹیں و دوسری چیزیں پھینکتا۔ اِس طرح وہ نیرو کے باپ موہن اور اُس کے بیوی، بچوں کو پھینکتا۔ جس طرح کپ، پلیٹیں اعتراض نہ کرتے اُسی طرح سے موہن بھی اعتراض نہ کرتا اور نہ ہی اُس کے بیوی، بچے۔ جب ایک مہینے کا عرصہ گزر جاتا اور پولیس بھی نہ آتی تو اُس کے دِل میں ایک عجیب وغریب خلش ہوتی۔ ایک دِن ہوا یہ کہ بہادر کے باپ گردھاری کا تبادلہ ہو گیا اور اُسے پھر اپنے گاؤں جانا پڑا اور وہ گاؤں چلا گیا۔ مگر تب تک غربت کا قد بھی بڑھا ہو گیا تھا۔ گردھاری اور وہ اپنے بیوی، بچوں کے علاوہ غربت اور بھوک مری کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اُس کے بچے بڑے ہونے لگے اور غربت کا قد اور اُونچا ہونے لگا اور اپنے پیچھے موہن اور اُس کے بچوں کی غربت کو چھوڑ گیا۔ بات آگے بڑھی کہ وہ الگ الگ جگہوں پر رہنے لگے تھے۔ مگر دونوں بچوں کے کپڑے چھوٹے ہونے لگے کیونکہ

اُن کے قد بڑھنے لگے اور ساتھ کے لوگوں کی آنکھیں بھی کھلنے لگیں۔ ایک سلسلہ در سلسلہ آگے بڑھنے لگا۔ خط و کتابت کی اُنہیں عادت نہ تھی۔ گردھاری کے بچوں کے جسم اب گرمی سے جھلسنے لگے اور سردی میں ٹھٹھرنے لگے۔ لڑکی بڑی ہوگئی۔ شادی کی فکر بھی آگے بڑھی۔ اُس کا بدن جوں جوں بڑا ہوتا گیا' لوگوں کی نظریں بھی تیز ہونے لگیں۔ اُن کی ضرورت زیادہ بڑھ گئی اِس لئے اب لوگوں سے کپڑے مانگنے کی نوبت آ گئی۔ گردھاری کے دونوں بیٹے پڑھ نہ سکے۔ اُدھر موہن ایک دِن اچانک تیرتھ یاترا کرنے کے لئے اُس شہر میں آیا۔ اُس کا بیٹا بھی اُس کے ساتھ تھا' جس نے خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھے اور بیٹی نے بھی سہاگ کا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ بیوی کے چہرے سے بھی خوشحالی ٹپک رہی تھی۔ گردھاری اُسے اچانک ملا۔ دونوں ایک دُوسرے کے گلے ملے۔ پھر گردھاری اُنہیں اپنے گھر لے گیا۔ موہن نے دیکھا وہی پھٹا پُرانا گھر ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تم میری بدحالی دیکھ کر پریشان ہو۔" گردھاری نے کہا اور موہن نے ہاں میں جواب دیا۔ "دوست میں تو تیری خوشحالی دیکھ کر خوش ہوا ہوں مگر حیران بھی۔" گردھاری نے اُس سے کہا۔ "اِس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں' سب کا وقت بدلتا ہے"۔ موہن نے جواب دیا۔ سب کا وقت بدلتا ہے۔ گردھاری کے بیوی' بچوں کو یوں لگا جیسے کوئی لفظ نہ سنا رہا ہو بلکہ آسمان سے پھول برسا رہا ہو۔

"اب تم پوچھو گے کہ یہ بدلاؤ کیسے؟"

"ہاں یہ جاننے کی خواہش ضرور ہے۔" گردھاری نے جواب دیا۔

سُنو ایک دن یوں ہوا کہ سب سوئے ہوئے تھے' رات کو سمندر جاگا' طوفان آیا' لوگوں کے گھر اُجڑے' کچھ لوگ مرے بھی اور میرا بیٹا بھی اُسی طوفان کے کام آیا اور مر گیا۔ ہم بھاگے۔ سب کچھ اُجڑ گیا۔ ہمارا کھوکھا بھی گر گیا۔ پولیس والوں کے بھی' اور لوگوں کے بھی گھر اُجڑے اور ہمارے گھر بھی۔ اِس کے ساتھ ہی ملزموں کے گھر

جھوں کے گھر' دوکانیں بنانے والوں کے گھر اور دوکانیں اجاڑنے والوں کے گھر بھی ختم ہو گئے ۔ اُس کے بعد ایک اور طوفان آیا مدد کا۔ اِس امدادی طوفان کی بدولت سب کو مکان ملے اور جو میرا بیٹا مرا تھا' اُس کے لئے دو لاکھ روپیہ بھی ملا' جس سے میری بیٹی کی شادی ہو گئی ۔ اِس مدد سے لوگوں کو فائدہ ملا۔ اپنے آپ کو ایک دُوسرے سے اچھا ثابت کرنے کا موقعہ ملا کیونکہ غریب تو ہم سونامی سے پہلے بھی تھے مگر کوئی مدد کے لئے نہیں آیا۔ بھوک پہلے بھی تھی مگر کھانا کھلانے کوئی نہ آیا۔ بڑے بڑے ایکٹر اور خوبصورت ایکٹریس اکھٹی ہوئیں۔ جہاں اُنہیں ایک دُوسرے کے ساتھ ناچنے کا موقعہ ملا۔ ایک دُوسرے کے بدن کو چھونے کا موقعہ ملا اور لوگوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ پھر خوب ریڈیو اور ٹی وی پر یہ پروگرام آئے ۔ میری بیٹی کی شادی پر تو مالنی خود آئیں۔ جن کی ایک جھلک دیکھنے کو لوگ بے قرار رہتے تھے۔ خوب تعریف ہوئی اُن کی ۔ حالانکہ سونامی سے پہلے بھی ہم بھوکے تھے' غریبی تھی۔ کبھی پولیس والے ہمارا گھر و چائے خانہ گرا دیتے تھے اور اب پولیس آفیسر ہمارے گھروں کے اندر آئے ۔ سیاسی پارٹیاں ایک دُوسرے سے آگے نکلنا چاہتی تھیں اور فلاحی ادارے بھی ایک دُوسرے سے آگے ہو کر مدد کرنا چاہتے تھے ۔ میرا گھر بن گیا۔ دُوسرا لڑکا اچھے اسکول میں داخل ہوا۔ پہلے دو لاکھ روپے ملے اور پھر تین لاکھ روپے اور اِس سے یہ سب بدلا ۔ سب نے مدد کی اور خوب پرچار ہوا۔

***

اور اِنتظار

لگتا ہے کہ پانی اُلٹی سمت چل رہا ہو یا دریا سے کئی منبعے نکل رہے ہوں اور سورج کی زمین پر رات کے پودے روشنی بکھیر رہے ہوں۔

وہ جب آتی تو خوشبو لگتا کہ اُس کی سانسوں سے نِکل رہی ہو اور سورج کو اور روشنی کی طلب ہو۔ سورج کتنا بڑا ہے' روشنی کا دریا ہے مگر اُسے رات کا کبھی دیدار نہ ہوا ہے۔ رات ہونے سے پہلے ہی اُسے جانا ہوتا ہے۔

وہ آئی اور اُس نے اِسے دیکھا اور اِس نے اُسے۔ پھر وہ دونوں ناچے' گھنٹوں ناچتے رہے۔ پتھر لگا کہ پگھل رہے ہوں اور پانی اِس طرح سے اُچھلا کہ سنگیت کے سُروں کو بکھیر رہا ہو اور گھنگھرو خود ٹانگوں کو سجا رہے ہوں۔ اُس وقت ایسے راگ بھی نکلتے ہیں جو لُطف تو دیتے ہیں مگر بعد میں یاد نہ رہتے ہیں۔ اُس کے آنے کا انداز بعد میں بھول جاتا ہے۔ اُس کا چہرہ کیسا ہے یہ یاد نہ رہتا ہے۔ وہ چھمک چھمک کر کے ناچتی ہے۔ وہ اُسے دیکھ کر پھر ناچتا ہے اور سوچتا ہے۔ خواب دیکھتا ہے اور خواب دیکھنے کے بعد پھر اُٹھتا ہے اور ناچنے لگتا ہے۔ پھر وہ ناچتے ہوئے اپنے خوابوں کو

آنکھوں میں بستا ہے، جن کا ذِکر نہیں پر بھی نہیں ہو سکتا اور ندیوں کے پانی سمندر میں جانے کے بجائے خود ایک دُوسرے سے ملنے کے لئے بیتاب ہونے لگتے ہیں۔ رات اور کالی ہو جاتی ہے اور روشنی خود بخود تیز ہو جاتی ہے۔ اِس طرح سے ایک سلسلہ آگے بڑھنے لگتا ہے اور بڑھتا ہی جاتا ہے۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ دُوسرے سلسلے جو آگے بڑھتے ہیں، اُن کی عمر کم ہوتی ہے۔ مگر اِس سلسلے کے بڑھنے کے ساتھ ہی اِس کی عمر بھی بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ایک دُوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ لگتا ہے ہوائیں اور فضائیں سب کو ایک دُوسرے کے قریب لانا چاہتی ہیں۔ اُن کا خوبصورت جسم کئی حِصّوں میں بٹ جاتا ہے۔ بچپن لڑکپن الگ الگ نظر آنے لگتے ہیں اور تمام رنگ خلط ملط ہونے کے باوجود الگ اپنا وجود ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک دُوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔

اُس نے کہا ''میں پیاسی ہوں۔''

''اور میں بھی پیاسا ہوں۔''

''تُم میرے لئے ندی ہو۔''

''تُم بھی میرے لئے دریا ہو، کیا ہمارا مِلن ہوگا.....؟''

دریا اور ندی کا سنگم ہوتا ہے اور پھر دونوں کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ وجود کو قائم رکھتے ہوئے محبت کیسے کی جائے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب کسی کے پاس نہ ہے۔ پھر مِلن کی آرزو کو چھوڑ کر تڑپ کو ہی مقدر بنا لینا چاہئے۔ ایک نے کہا اور دُوسرے نے سُنا۔

''میری صبح کئی راتوں کے بعد ہوتی ہے اور میں صبح ہوتے ہی اُٹھ جاتا ہوں۔ پھر دریا کے کنارے بیٹھ کر تپسیا کرتا ہوں۔ سورج کی گرمی برداشت کرتا ہوں۔ اپنے لہو کے عوض پھول خرید کر بدن کر سجاتا ہوں۔ اِسے خوبصورت بناتا ہوں۔ حالانکہ گیان کے فلسفے مجھے کہتے رہتے ہیں کہ سب فانی ہے۔ ہر شے نے چلے جانا ہے مگر یہ

جانتے ہوئے بھی تیرا انتظار کرتا ہوں اور کھڑا رہتا ہوں۔''

''اور میں بھی جسم کو سنوارتی ہوں۔ رات کو اپنے چہرے کی سفیدی دے کر اور سیاہی لے کر اپنی زُلفوں کو سجاتی ہوں اور اپنی سانسوں کو جلا کر رِشتوں میں روشنی پیدا کرتی ہوں اور اپنے ہاتھوں کے عوض چاندنی کی تھالی لے کر اِن رِشتوں کو اُس میں رکھتی ہوں۔ تمہیں دیکھنے کے لئے، آنکھوں کی روشنی پانے کے لئے قدرت سے سودا کرتی ہوں۔ اِس کے لئے مجھے پانی اور دھُوپ دونوں کی تپسیا کرنی پڑتی ہے اور میں بھی تُمہارا اِنتظار کرتی ہوں۔ تم سامنے آجاتے ہو اور آنکھیں تمہارے جسم کو دیکھنا چاہتیں ہیں۔ جسم جسم کے گلے ملنا چاہتے ہیں۔'' اُس نے کہا ''تم سے ملنے سے پہلے کی خواہش کرنے سے پہلے میں بھی پھولوں کے درختوں کو پانی دینے لگتا ہوں اور سانسوں میں خوشبو کو قید کر دیتا ہوں تاکہ ہوا اور معطر ہو سکے اور ایسا کرتے ہوئے میرے پھیپھڑوں میں ایک عجیب سی چُبھن پیدا ہوتی ہے۔ مگر میں یہ سب برداشت کرتا ہوں......''

''میں بھی چاند کی چاندنی کو آنکھوں کے اندر بسا کر تمہارا اِنتظار کرتی ہوں اور ایسا کرتے ہوئے میری آنکھوں کی روشنی میں بھی کمی آجاتی ہے۔ لفظ جو تمہارے لئے سنبھال کر رکھتی ہوں، اُن کی وجہ سے ہی میری زبان بھاری ہو جاتی ہے۔''

دیکھنے والے بھی کئی یُگوں تک اِنتظار کرتے ہیں۔ آخر کار پوچھ ہی لیا۔ روشنی والے شخص نے جو اندھیروں کا بیوپار کرتا تھا، کہ یہ کب ملیں گے۔ مگر دُوسرے ہی لمحے میں ایک گٹھڑی آسمان سے گری جس میں لفظ تھے۔ اور وہ لفظ جب کُھلے تو یوں نمودار ہوئے۔ اِن کی قسمت میں سجنا سنورنا ہے، پھر ایک دُوسرے کا اِنتظار کرنا ہے، مگر مِلنا اِن کا مقدر نہ ہے۔ کیونکہ اِنتظار میں ہی ساری دُنیا کا مزا ہے اور زِندگی بھی اِنتظار ہے اور زمین بھی اِسی اِنتظار میں ہے۔ سورج کے گرد گھومتی ہے کہ کبھی نہ کبھی ضرور اُسے سورج سے ملنے کا موقعہ ملے گا اور یہی حال چاند کا ہے۔ بس ایک سلسلہ ہے جو اس

طریقے سے چلا آرہا ہے۔ دیکھنے والے یہ سن کر حیران ہو گئے۔

''مگر یہ کب تک ہوتا رہے گا؟'' ایک بچے نے پوچھ لیا۔

''یہ ہی ہونے سے زندگی یہاں قائم ہے۔''

''وہ کیوں.....؟'' کیونکہ اگر یہ آپس میں ملیں گے تو پھر دریاؤں کا سنگم نہ ہوگا اور بیج زمین سے نہ اُگیں گے کیونکہ یہاں پر ہر چیز کا ایک دُوسرے سے تعلق ہے۔ اِس لئے پھول نوچنے کے بجائے دیکھو اور مزا لو۔

***

روشن لعل اور سلیم خان کے درمیان ہمیشہ تضاد رہتا تھا۔ ہر وقت ایک دُوسرے کے گھر کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ اگر ایک کے لڑکے نے قمیض اچھی لگائی تو دُوسرا فوراً بازار گیا اور اُس سے بہتر لایا۔ دونوں کی بیویاں اِس تضاد سے اِس لئے تنگ تھیں کیونکہ سبزی تو ایک بنتی مگر دِکھانی ایک دُوسرے سے زیادہ پڑتیں۔ روشن لعل کی بیوی ایک سبزی کو پانچ اور پتیلوں میں ڈال کر یہ ظاہر کرتی کہ اُن کے گھر میں چھ سبزیاں بنتی ہیں اور یہی حال سلیم خان کی بیوی کا بھی تھا۔ برتن صاف کرتے ہوئے اُن کے ہاتھ کھردرے ہو گئے تھے۔

ایک نے جھوٹ کہہ دیا کہ آج میٹھے چاول بنیں گے' تو دُوسرا بازار گیا اور حلوے کا سامان لے آیا۔ لیکن اُسے اپنی بیوی کی ساڑھی بیچنی پڑی۔ بات یہاں تک آ پہنچی کہ اگر ایک نے اپنے لڑکے کو ایک مُکہ مارا تو دُوسرے نے دو۔ ایک نے اپنی بیوی کو ماں کی گالی دی تو دُوسرے نے اُس کے باپ کی۔ ہر بات میں اُن کا مقابلہ ہوتا تھا۔ پھر وہ دونوں ایک دُوسرے کے وجود کو ہی اپنے لئے ایک مسئلہ سمجھنے لگے۔ روشن

لعل کے دل میں خیال آیا کہ اگر سلیم خان نہ ہوتا تو اُس کے مکان میں خوب دھوپ آتی۔ اسی طرح سلیم خان سمجھنے لگا کہ اُس کے گھر کی ہوا روشن کے گھر نے روکی ہے۔ سائیں بابا اُن کی یہ باتیں سمجھ کر ہنستا تھا۔

ایک دِن سلیم نے زور سے کہا ''ایک دِن ایسا آئے گا جب سب لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔''

اِس پر سائیں پھکڑ ہنسا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا ''اُس دِن کوئی مسلمان نہ رہے گا........'' سلیم اور روشن ایک دُوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

اِس پر سائیں پھکڑ ہنس کر کہنے لگا۔ ''جب کچھ ہندو و کرسچن ہیں تو لوگ کچھ مُسلمان ہیں۔''

روشن لعل کب چُپ رہنے والا تھا۔ اُس نے ایک دم کہا ''ایک وقت ایسا آئے گا' جب سب کو پوجا کرنی پڑے گی۔'' اِس پر سائیں پھکڑ ہنسا۔

''کاش ایسا وقت آئے کیونکہ ایک زبان میں جس کو پوجا کہتے ہیں تو اُسی کو دُوسری زبان میں نماز کہتے ہیں۔'' مگر اُن پر اِن باتوں کا کوئی اثر نہ تھا۔

روشن لعل صبح اُٹھ کر خوب گھنٹیاں بجاتا اور اِتنے زور سے پوجا پاٹھ کرتا کہ سلیم خان ضرور سُنے اور سلیم خان بھی زور زور سے قرآن خوانی کرتا۔ روشن لعل کا مقصد یہ ہوتا کہ سلیم خان کی نماز میں خلل پڑے اور سلیم خان کا مقصد بھی یہی ہوتا کہ روشن لعل اچھی طرح پرارتھنا نہ کر سکے۔ وہ اُس کی نماز کو اپنا دُشمن سمجھتا تھا اور وہ اُس کی پوجا کو۔ سائیں پھکڑ زور سے کہتا۔ ''زمین کو ایک اکائی سمجھ لو اور اچھی طرح یاد رکھو' جس دِن کعبہ میں پہلی نماز پڑھی گئی' اُس روز بھی تو کاشی میں پوجا ہو رہی تھی۔ کاشی میں پوجا بند کر کے نماز نہ پڑھی گئی ہے اور یہ بھی جان لو کہ پوجا اور نماز کی آپس میں کوئی لڑائی نہیں ہے۔'' سائیں پھکڑ نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ مگر اِن باتوں کا سلیم خان اور روشن لعل پر کوئی اثر نہ ہے۔

مگر اُس دِن شہر میں ایک عجیب وغریب واقعہ ہوا۔ وہ یہ کہ روشن لعل کا لڑکا کہیں گُم ہوگیا۔ کوئی اُسے اُٹھا کر لے گیا۔ روشن کا لڑکا بے گناہ تھا۔ اُس کا کوئی قصور نہ تھا۔ اُس نے ابھی زِندگی دیکھی ہی نہ تھی۔ روشن پولیس سٹیشن چلا گیا مگر وہاں پر حوالدار بھاگ رہا تھا' کیونکہ ایس. پی. صاحب کے لڑکے کا ناخن زیادہ کٹ گیا تھا۔ تھانے دار وتھانے کا سارا اسٹاف اِسی بات میں مصروف تھا۔

سب پریشان ہوگئے۔ سلیم خان بھی اندر سے کافی پریشان تھا مگر باہر سے کہہ رہا تھا دیکھا مجھ سے دُشمنی کا صِلہ۔ اصل میں اللہ نے سبق سکھانے کے لئے سب کچھ کیا ہے۔ لڑکا تو تیرا تجھے مل جائے گا اور ملنا ہی چاہئے۔ مگر تجھے سبق سکھانے کے بعد ہی ایسا ہوگا۔ روشن لعل کی پریشانی بڑھنے لگی۔ اب وہ سلیم خان کی نماز پر کسی بھی طریقے سے اعتراض نہ جتاتا ہے۔ بلکہ اُسے کہتا تھا کہ وہ اُس کے حق میں ہی دُعا کرے۔ وقت بیتا۔ بچّے کی تلاش جاری رہی۔ سلیم خان پر بھی شک ہوا اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ سب لوگ بچّے کو ڈھونڈتے رہے مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

مگر اور لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہونے لگا۔ ہوا یہ کہ سلیم خان کا بچّہ بھی گھر سے ایک دِن گیا اور واپس نہ آیا۔ سلیم خان پریشان ہوگیا۔ دِن رات سوچنے لگا کہ یہ کیا ہوگیا۔ پہلے سامان چوری ہوتا تھا' پھر گردے اور آنکھیں چوری ہوتی تھیں' اب کے بچّے ہی چوری ہونے لگے ہیں۔ اُس نے روشن لعل سے کہا کہ میرے حق میں بھی پرارتھنا کرنا۔ شاید پرارتھنا اور دُعا مل کر ہمارے بچّوں کا مسئلہ حل کر دیں۔

شہر کے اندر کہرام سا مچ گیا۔ وہ دونوں بچوں کی تلاش میں پاگل ہونے لگے۔ اُن کی بیویوں نے کھانا کھانا بند کر دیا۔ چڑیوں نے چہچہانا چھوڑ دیا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ اُن کا دُکھ ایک جیسا ہے' اُن کی بیویوں کو جنتے وقت ایک جیسی تکلیف ہوئی ہے' اُن کی آنکھوں سے آنسو ایک ہی طرح سے نکلتے ہیں۔ صرف پوجا و نماز کے طریقے الگ ہونے سے وہ الگ تھوڑا ہی ہو سکتے ہیں۔ بچّوں کے گُم ہونے کا سلسلہ جاری تھا۔

ہزاروں کی تعداد میں پولیس موجود تھی نمازیں اور پرارتھنائیں ہو رہی تھیں۔ بے شمار مذہبی عمارتیں بھی تعمیر ہو رہی تھیں۔ مگر لوگوں کے بچّے گُم ہو رہے تھے۔

ایک دِن شہر میں بچوں کی ہڈیاں ملیں، نعشیں ملیں۔ وہ دونوں بھاگے۔ اُنہیں معلوم ہوا کہ اُن کے بچوں کا قتل ہو گیا ہے۔ وہ چُپ چاپ یہ سب سہتے گئے۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دُوسرے کی پوجا و نماز پر اعتراض کرنے میں مصروف رہے اور اُن کے گھروں سے اُن کے بچّے چوری ہو گئے اور پھر قتل ہو گئے۔

***

ہار کی جیت

گوپالنی لڑکپن سے جوانی کی طرف جا رہی تھی۔ ہَوا، سورج، اِنسان سب اُسے دیکھ رہے تھے۔ لگ رہا تھا جیسے مالی کلی سے پھول بننے والے گلاب کو دیکھ رہا ہو۔ گوپالنی ہر صبح اپنے آنگن میں کھلتے ہوئے پھولوں کو دیکھتی تو لگتا گلاب کے پھولوں کی بستی میں گٹھے کے پھول سیر کرنے آئے ہوں اور ہَوا خوشبو کا کھیل کھیل رہی ہو۔ خوشبو کا کھیل، رنگوں کا کھیل۔ جہاں اِس دُنیا میں پانی رنگوں کا کھیل کھیلتا ہے وہیں ہَوا خوشبو کا کھیل کھیلتی ہے۔ گلاب کے پھولوں کی خوشبو گٹھے کے پھولوں کی خوشبو میں ملا دیتی ہے۔ تو لگتا ہے کہ جنت کی اپسرائیں دھرتی پر جنم لینے کی دُعا کر رہی ہوں اور مکتی و نجات کے فلسفے بے کار نظر آتے ہیں۔ اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ عشق کا کھیل مذہبی میناروں سے زیادہ اُونچا مقام رکھتا ہے۔ اصل میں ہَوا اِنسان کی سب سے بڑی ضرورت ہی نہیں بلکہ سب سے بڑی دوست ہے۔ وہ اِنسان کے دُکھوں کا علاج کرتی ہے۔ جب اِنسان دُکھ محسوس کرتا ہے تو اُس کے اندر کی ہَوا دُکھی ہو جاتی ہے۔ پھر اُس

کے بدن سے نکل کر کہیں اور چلی جاتی ہے۔ پہاڑوں سے ٹکراتی ہے۔ ریگستانوں سے گزرتی ہے تاکہ دُکھ کی ہوا سُکھ میں بدل جائے اور ایسا کرتے ہوئے اُسے سفر کرنا پڑتا ہے۔ دوڑنا پڑتا ہے۔ مگر یہ ایسا کرتے ہوئے بھٹکتی نہیں اور تپسیا کرتی ہے۔ ہَوا کبھی نفرت اور بدلے کے بارے میں نہیں سوچتی۔ اِنسان تو ایک لمحے میں نفرت کے بارے میں سوچ کر اُسے گندہ کر دیتا ہے۔ مگر اُسے برس بیت جاتے ہیں اپنے آپ کو صاف کرنے میں۔ ہَوا کا سفر دُوسروں کے لئے جینا' ہر ایک کو زِندگی دینا ہے۔ میدانوں کی ہَوا پہاڑوں پر ٹھنڈی ہو کر پھر میدانوں میں آ جاتی ہے۔ میدانوں کی ہَوا گرم ہو کر پھر پہاڑوں پر چلی جاتی ہے۔ گرم ہَوا' ٹھنڈی ہَوا' بدبودار ہو مگر نہ اُس کا جسم کم ہوتا ہے اور نہ ہی مر سکتی ہے۔ یہ امر ہے۔ کہاں سے پیدا ہوئی۔ اِسے نہ جانے کہاں جانا ہے۔ یہ زِندگی دے کر بدلے میں کیا لیتی ہے۔ یہاں تک اِنسان کی سوچ نہ پہنچ سکتی ہے اور پھر اُس کے گھر کے بارے میں بھی کسی کو معلوم نہ ہے۔

گوپالنی اپنے خوبصورت و کنوارے ہاتھوں سے روٹیاں بناتی ہے' کپڑے دھوتی ہے' کھانا بناتی ہے' مگر سب سے ضروری کام وہ یہ کرتی ہے کہ سویٹر بُنتی ہے۔ رنگ برنگے سویٹر' نیلے سویٹر' پیلے سویٹر' نیلے پیلے سویٹر۔ گوپالنی جب اپنے دھیان میں مست ہو کر بُنتی ہے اور سلائیاں چلاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ نرگس کے پھول ہَواؤں کے دامن پر گھٹے کے پھولوں کی سلائیوں سے گلاب کے پھولوں کی وہ پتیاں بُن رہے ہوں جن سے ایک لفظ لکھا گیا تھا۔ جِسے کہیں اوم اور کہیں اللہ پڑھا گیا۔ بس سلائیوں کا اپنے آپ عجیب سلسلہ ہے۔ پیلے رنگ کی اُون... نیلے رنگ کی اُون... گلابی رنگ کی اُون خوبصورت عورتیں لاتی ہیں اور گوپالنی کو دیتی ہیں۔ تو لگتا ہے کہ خوبصورت رنگ سورج کی روشنی سے آزاد ہو کر جینا چاہتے ہیں اور ہَوا چاہتی ہے کہ پھول کبھی نہ مرجھائیں اور خوبصورت چہروں پر کبھی جھریاں نہ آئیں۔ گوپالنی بڑی ہوگئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ زِندگی کا سفر طے کر رہی تھی سویٹر بُنتے ہوئے۔ گلی کے لڑکے

جب وہ سویٹر پہنتے تو لگتا کہ چاند ستارے سورج کی روشنی کو اپنے اُوپر اوڑھ رہے ہوں۔ایک اچانک واقعہ ہوگیا۔ہُوا یہ کہ گوپالنی کا باپ مرگیا۔اُس کا چھوٹا بھائی اور ماں اُس کے سہارے پر آگئیں اور لگا کہ ایک خوبصورت چھوٹی ندی میں ایک بہت بڑا نالا مِل گیا ہو اور وہ اچانک دریا بن گئی ہو۔گوپالنی اپنے باپ کی موت کے بعد اچانک بڑی ہوگئی۔

گوپالنی کا شوق ضرورت میں بدل گیا۔اب وہ دِن رات سویٹریں بُنتی۔ رنگ برنگی خوبصورت اُون کا ڈھیر اُس کے آگے لگ جاتا۔اُس کا کھانا پینا بند ہو گیا۔خوبصورت اُنگلیاں لگاتار چلنے لگیں اور چلتی ہی جاتیں۔

سردی کا موسم تھا۔سمیر، جو کہ گوپالنی کے ساتھ کھیل کھیلا کرتا تھا، گوپالنی کو دیکھتا رہتا تھا۔اور اُسے دیکھتے رہنے کا بہانہ تلاش کرنے لگا۔آخر کار سردی آگئی اور اُس نے گھر میں اعلان کیا کہ اُسے سویٹر چاہیے۔مگر اُس کا باپ اصل بات کو جان گیا تھا۔اُس نے اُسے خوب مارا۔مگر وہ سب اُس نے برداشت کیا۔کئی دِنوں تک اُس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔آخر تنگ آکر اُس کے باپ نے اُسے کچھ روپے دئے جنہیں لے کر سمیر بازار گیا۔اُس نے اُون خریدی اور گوپالنی کے پاس گیا۔اُس روز اُس کے باپ نے اُسے پھر پیٹا اور وہ زور سے چیخا۔"کہا تو تھا کہ سویٹر لا مگر اُون لے آیا۔" اِس بات کا کوئی جواب سمیر کے پاس نہ تھا۔

"یہ اُون کہاں سے آتی ہے؟" ایک دِن سمیر نے پوچھا۔

"بھیڑوں کے جسم پر لگتی ہے۔"

"یہ بھیڑیں کہاں ہوتی ہیں؟"

"جنگلوں میں....." گوپالنی نے سلائیاں چلاتے ہوئے جواب دیا۔

"بھیڑیں اور جنگلوں میں۔" سمیر کا انگ انگ بول پڑا۔سمیر دوڑا اور جنگل میں چلا گیا۔وہاں اُس نے بھیڑیں دیکھیں۔خوبصورت بھیڑیں، رنگ برنگی بھیڑیں،

نیلے پیلے رنگ کی' گلابی رنگ کی' سفید رنگ کی۔

ایک معصوم سی لڑکی اُن بھیڑوں کو چراتی تھی۔ بھیڑیں درختوں پر لگے ہوئے پتے کھا رہی تھیں۔ سمیر یہ سب دیکھ کر حیران ہو گیا۔ ''گوپا' تیری بھیڑ میرا درخت کھا رہی ہے۔'' گوپا کی سہیلی نے کہا مگر گوپا نہ جانے کیوں سمیر کی طرف ہی دیکھے جا رہی تھی اور دیکھتی رہ گئی۔ ایک سلسلہ چلتا گیا۔ سمیر نے گوپا سے اُون مانگی۔ گوپا نے کہا۔

''اُون کیوں ساری بھیڑیں لے لو۔''

''نہیں مجھے صرف اُون ہی چاہئے۔''

گوپا نے کئی رنگوں کی اُون سمیر کو دے دی۔ سمیر گوپالنی کے پاس چلا گیا اور وہ اُون اُسے دے دی۔ گوپالنی نے ایک خوبصورت سویٹر بُنا' جس کا اگلا حصہ سفید اور کالے رنگ کی اُون کا تھا' پچھلا حصہ پیلے اور ہرے رنگ کی اُون کا' سویٹر کے بازو لال رنگ کی اُون کے تھے۔ یہ سویٹر جب سمیر نے پہنا تو اُس پر کافی جچا اور سمیر اور بھی خوبصورت لگا۔ مگر گوپالنی اِن سب باتوں کا اِظہار نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ اُسے سویٹر ہی بُننا تھا۔ مگر نہ جانے کیا ہوا سمیر کے دِل کے اندر گوپالنی اور بس گئی۔ وہ صرف گوپالنی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُسے ہر لڑکی گوپالنی نظر آتی اور گوپالنی کو ہر لڑکا سمیر۔ گوپالنی سویٹریں بُنتی ہی گئی۔ اِدھر سمیر نے گوپالنی کے لئے اُون لانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ نیلے رنگ کی قمیض اور سبز رنگ کی پینٹ کے اُوپر ہرے اور پیلے رنگ سے مل کر بنی ہوئی سویٹر جب سمیر نے پہنی تو وہاں آ کر کئی لوگوں نے ڈھول بجانا شروع کر دیا اور کنواری لڑکیوں نے گانے گانا شروع کئے۔ سمیر اب کالج جانے کے قابل نہ رہا تھا۔ مگر یہ سویٹر اور اس طرح کا لباس پہن کر سمیر جب گوپا کے پاس گیا تو بھیڑیں بولنے لگیں۔ گویا کہ ایک ایک بھیڑ کہہ رہی ہو ''میں جینا چاہتی ہوں۔'' اور گوپا تو سمیر کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

''بڑے خوبصورت لگ رہے ہو سویٹر پہنے ہوئے۔''

''گوپالنی نے تیار کی ہے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''کبھی مجھے بھی ملاؤ گے؟'' یہ سن کر سمیر حیران رہ گیا۔

نہ کوئی جلن نہ کوئی حسد۔ اِس کے اُلٹ گوپالنی کو دیکھنے کی چمک گوپا کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ گوپا اُس کے بارے میں سوچ کر خوش ہو رہی ہو جسے سمیر چاہتا ہے۔ وہ کیسی ہوگی۔ اُس دِن اُسے سمیر بہت خوبصورت نظر آیا۔ گوپا بھی بہت خوبصورت تھی مگر پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔ وہ جب شلوار قمیض پہنے اپنی بھیڑوں کے بیچ میں سے گزرتی تو لگتا جیسے شفق کے رنگ بکھرنا چاہتے ہوں اور الگ الگ ہوکر زمین پر رہنا چاہتے ہوں یا سورج کی روشنی الگ الگ رنگوں میں بٹ کر زمین پر آنا چاہتی ہو۔ گلشن، جو کہ سمیر کے ساتھ پڑھتا تھا' اُس نے جب سمیر کے جسم پر وہ سویٹر دیکھی تو اُس نے سوچا کہ ضرور گوپالنی میں بھی کوئی خاص بات ہوگی۔ اُس نے گوپالنی کو جھٹ سے دیکھا اور اُسے حاصل کرنے کی خواہش اُس کے دِل کے اندر ایک ہی لمحے بیدار ہوئی۔ گلشن اُس شہر میں رہتا تھا مگر اُسے یقین نہ تھا کہ غریب بستیوں میں خوبصورت لوگ رہ سکتے ہیں۔ جنگل میں جانا اُس کا شوق تھا۔ ایک دِن گلشن شکار کرنے کے لئے جا رہا تھا۔ اُس نے بندوق اُٹھائی اور تھوڑا پیدل چلنے لگا پھر اُسے گوپالنی یاد آئی۔ اُس روز اُس کی آنکھوں نے شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے خواہش کے پتھر گوپالنی پر مارے مگر راستے میں سمیر کا سینہ تھا۔

گلشن کے دِل کے اندر ہر چیز کو پانے کی خواہش تھی اور وہ زِندگی سے ہارنا نہ چاہتا تھا۔ ایک دم اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ گوپالنی کو سویٹروں کے سمیت خریدے گا۔ اُس نے وہی کیا۔ گوپالنی اُس کی ہوگئی۔ اُسے ایک بنگلہ' کار مل گئی لیکن سویٹر بُننے کا شوق ختم ہوگیا۔ اب وہ بازار سے خریدی ہوئی مشینی سویٹروں کو پسند کرتی تھی اور لمبے لمبے کوٹ پہنتی تھی۔

ایک دِن گلشن پھر جنگل میں شکار کرنے کے لئے گیا اور وہاں وہ گوپا سے

ملا۔ کیونکہ گلشن نے جنگل میں شکار کرنا تھا اور گوپا سے اُس کی جان پہچان ہو گئی تھی۔ اُس نے اُس سے کہا کہ سمیر خوش نہ ہے۔ گوپا نے گلشن کی طرف دیکھتے ہوئے اتنا کہا۔ ''یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ وہ خوش نہ ہے۔ سمیر نے محبت کی ہے اور محبت جتنی زیادہ کی جاتی ہے اُتنی خوشی ہوتی ہے۔ سمیر کو گوپالنی کا بُنا ہوا سویٹر پہننے میں جو مزا آتا ہے وہ تمہارے اِن خوبصورت ورنگ دار کپڑوں میں نہ ہے۔ اُسے اُس گلی میں بھٹکنے میں سکون ملتا ہے۔ وہ اُن گھروں میں سونے سے نہ ہے جن میں گلشن سوتا ہے۔''

سمیر دن رات سویٹر پہنے ہوئے گلی میں بیٹھا رہتا تھا۔ گرمیاں آ گئیں مگر سمیر وہاں رہا۔ وہ کسی بھی حالت میں اُس سویٹر کو نہ اُتارتا تھا۔

یہ بات گلشن کو پسند نہ تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں گوپالنی یہ ظاہر کرتی تھی کہ سمیر اُسے بہت چاہتا ہے۔ اِدھر سمیر کی آنکھیں اور گہری ہو گئیں۔ اُس کی داڑھی بڑھ گئی۔ اُس کے منھ سے نکلنے والے لفظ یوں لگ رہے تھے جیسے سمیر شاعری کر رہا ہو۔ لوگ اُسے سادھو ماننے لگے تھے۔ اُس کے ارد گرد بچے بیٹھے رہتے۔ کنواری لڑکیاں اپنی چاہت کو حاصل کرنے کے لئے وہاں منتیں مانتیں۔ اُس کی محبت کا قصہ گاؤں گاؤں شہر شہر مشہور ہو چکا تھا۔ اِس بات سے گلشن پریشان تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب وہ کیا کرے؟ کیا وہ اُس کا قتل کروا کر اُسے باہر پھینکوا دے؟ مگر وہ ڈر رہا تھا۔ پریشان تھا۔ وہ کئی منصوبے بنانے لگا۔ ہر روز وہ گوپالنی کو طعنے مارتا۔ اُس نے گوپالنی کا جینا حرام کر دیا۔ وہ ناجائز فقرے اُس پر کستا۔ گوپالنی پریشان رہنے لگی۔ اُسے سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ایک دِن جنگل سے بھیڑیں آئیں اور ساتھ میں گوپا بھی۔ سب نے سمیر کا گھیراؤ کیا اور اُسے اپنے ساتھ لے گئیں۔ گلشن کو لگا جیسے وہ جیت کر بھی ہار گیا ہو۔

***

بیراگن

گوتم پرشاد کو نہ جانے اچانک کیا ہوا کہ دِل ہی دُنیا سے اُچاٹ ہوگیا۔ ہر وقت دُوسری دُنیا کے بارے میں سوچنا اُس کا مقصد ہوگیا۔ خوبصورت ونوجوان تھا۔ جسم نہایت ہی اکڑ والا' آنکھیں گہری' ہونٹ جیسے دعوت نامہ ہوں۔ جب ہر طرف سے دِل اُچاٹ ہوگیا تو اُس کی شادی سریتا نامی لڑکی سے ہوگئی۔ سریتا جیسے آسمان سے کوندتی ہوئی کوئی بجلی ہو۔ مگر بہت خوبصورت نہ تھی۔ وہ ہر طرح کا شنگار کرتی۔ اُس کا دِل بہلاتی مگر گوتم پرشاد کا دِل کسی بھی طریقے سے دُنیا میں نہ لگا۔ وہ سریتا کے جسم کے قریب جاتا تو یوں لگتا جیسے مجبوری کے تحت وہ یہ کوئی کام کررہا ہو۔ سریتا شائد اُتنی خوبصورت نہ تھی کہ گوتم پرشاد کے بیراگ کو بھوگ میں بدل سکے۔ وہ بنتی مگر نہ جانے کیوں کسی بھی طریقے سے گوتم پرشاد کو دُنیا میں نہ لاسکی۔ گوتم پرشاد کا باپ ہر پرشاد بھی کافی پریشان رہتا تھا۔ ایک ہی بیٹا اور لاکھوں کا کاروبار تھا۔

ایک دِن اُس نے کہا "بیٹی کوئی ایسا طریقہ کرو کہ اُس کا بیراگ ٹوٹے۔"

''پتا جی ہر روز تو بنتی سنورتی ہوں۔ مگر کیا کروں........اُن کو پسند نہ ہوں۔''

سریتا نے جواب دیا۔

گوتم کی ماں بھی اُس سے پریشان تھی اور ہر روز سوچتی رہتی تھی۔ ایک دِن اُس کی ماں نے کہا ''اب کیا کیا جائے.....؟''

''ماتا جی اگر اُن کا بیراگ ختم ہو جائے تو اُن کی دُوسری شادی کے لئے بھی میں کہوں۔'' گوتم کے باپ نے یہ سُنتے ہی کہا۔ ''ضروری نہیں کہ اِس سے بیراگ ختم ہو۔ سچائی یہ ہے کہ اِس سے تو بیراگ بڑھ بھی سکتا ہے۔'' مگر سریتا پر ہر طرف سے زور تھا کہ وہ کسی طریقے سے اُس کا بیراگ کو ختم کرے۔

وہ رات کو بغیر کپڑوں کے سوتی۔ اُس سے زبردستی کرتی۔ مگر یہ سب کچھ بے کار تھا۔ کیونکہ گوتم پرشاد دُنیا سے بیزار تھا۔ سریتا بچے کو جنم اِس لئے نہ دینا چاہتی تھی کیونکہ اُس نے مہاتما گوتم بُدھ کی کہانی اچھی طرح پڑھی تھی اور پھر تیاگ سے پہلے بچّے کا ہونا ضروری ہے۔ سریتا اِس بات کو بخوبی جانتی تھی۔ اُس کی اِسی بات سے بھی گوتم پرشاد کا باپ ہر پرشاد کافی پریشان تھا۔ کیونکہ اگر بچّہ جنما تو یہ بیراگ کہیں تیاگ میں نہ بدل جائے۔ اِس بات سے ہر پرشاد اور بھی پریشان ہونے لگا۔ اُسے اپنی زِندگی ایک بوجھ محسوس ہونے لگی۔ مگر سریتا کو اپنے آپ میں کمی نظر آئی۔ وہ کمی کیا تھی، سریتا کو محسوس نہ ہوسکا۔ سفر آگے بڑھتا ہی گیا۔ سریتا نے سوچا کہ شاید وہ اِتنی خوبصورت نہ ہے۔ شاید وہ اِتنی حسین نہ ہے۔ ایک دِن گلی میں ایک لڑکی جارہی تھی اور گھنگھرو بجارہی تھی۔ سریتا نے دیکھا کہ گوتم پرشاد باہر دیکھ رہا تھا۔ سریتا نے محسوس کیا کہ گوتم پرشاد گھنگھرو پسند کرر ہا ہے۔ پھر اُس کے بعد سریتا نے قسم کھائی کہ اب وہ ضرور اُس کا بیراگ ختم کر کے ہی دم لے گی۔ وہ شام کو اُٹھی اور گوتم پرشاد کو سجا سنوار کر کار میں بیٹھا کر لے گئی اور پھر اُسے ویشیا کے پاس پہنچا دیا، جو بہت خوبصورت تھی اور حسین تھی۔ وہاں پر ناچ گانا چل رہا تھا۔ گوتم پرشاد اور سریتا بھی ناچ گانے میں شامل ہونے لگے اور پھر یہ روز کا سلسلہ

بن گیا۔ محفل لگتی تھی، خوب ناچ گانا ہوتا تھا۔ وہ وہاں پر کافی دیر تک بیٹھتے تھے۔ گوتم پرشاد کا دِل بھی وہاں لگنے لگا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے وہ ویشیا حد سے زیادہ خوبصورت لگنے لگی اور اصل میں وہ ویشیا تھی بھی حد سے زیادہ ہی خوبصورت۔ وہ ناچتی تو لگتا کہ وہ نہیں بلکہ گھنگھرو ناچ رہے ہیں۔ بات کرتی تو لگتا کہ لفظ اُس کے منہ سے باہر نکلنا چاہتے ہوں۔ دیکھتی تو لگتا کہ نظارے اُس کی آنکھوں کے ذریعے دیکھنا چاہتے ہوں۔ وہ ہر روز اُس کو لے جاتی۔ آہستہ آہستہ گوتم پرشاد بیراگ کو چھوڑنے لگا۔ وہ بازار جاتا اور نئی ساڑھیوں میں سے ایک پسند کرتا اور اُس ویشیا کے لئے لے جاتا۔ بڑے بڑے خوبصورت زیور گوتم پرشاد اور اُس کی بیوی خریدتے، گلدستے بناتے اور پھر اُس کے لئے لے جاتے۔ یہاں تک کہ کئی طرح کے لذیذ کھانے بھی وہ پکاتے۔ گوتم پرشاد کا دِل اُسی دُنیا میں لگنے لگا۔ سریتا بڑی خوش ہوگئی کہ چلو اُس کے پتی کا بیراگ ختم ہونے لگا ہے۔ مگر اِدھر سریتا گوتم پرشاد کو ایک بوجھ نظر آنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ سوچنے لگا کہ اُس کی دُنیا میں سریتا کی ضرورت نہ ہے۔ اِس بات کا سریتا کے دِل پر کافی اثر ہوا۔ اُسے یہ دُنیا بے کار نظر آنے لگی۔ اُسے لگا کہ ہر چیز یہاں صرف اپنے لئے جیتی ہے اور اِس کے سوا کچھ نہ ہے۔ وہ دن رات مُسکراتی مگر ایک دن اُسے محسوس ہوا کہ یہ دُنیا کچھ نہ ہے۔ اُس کا خاوند اُس کے سامنے ویشیا کو پیار ہی نہیں بلکہ اُس سے نفرت بھی کرتا ہے۔ رات کو اُس کے پاس نہ سوتا ہے۔ وہ کپڑے ویشیا کے لئے خریدتا ہے اور گہنے بھی اُسی کے لئے۔

سریتا اِس دُنیا سے پریشان ہونے لگی۔ اُس نے دل و جان سے گوتم پرشاد کو چاہا۔ اُس کو لگا کہ ہر چیز یہاں مٹنے کے لئے ہے، ختم ہونے کے لئے ہے اور اس کے علاوہ کسی چیز کی کوئی اہمیت نہ ہے۔ اُس کے لڑکپن کا پرانا ساتھی نارائین جو اُسے حد سے زیادہ چاہتا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں ہمیشہ مست رہتا تھا۔ دن رات شراب پیتا، گلی گلی گھومتا، مگر سریتا کو معلوم ہوا کہ وہ کچھ نہ کر سکتی ہے۔ کیونکہ وقت یہاں پر انسانی

بدنوں کو کھلونوں کی طرح پھینکتا ہے۔

ایک دن سریتا بازار گئی اور بھگوے کپڑے لے کر آئی۔ گوتم پرشاد پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ویشیا کے پاس گیا اور اُس سے کہا وہ اُس کا ہو گیا ہے۔ اس پر ویشیا نے کہا، اُس کا وقت بٹا ہوا ہے۔ اُس کا حُسن گلی میں لگے بلب کی طرح ہے جو راستہ تو روشن کر سکتا ہے مگر کسی کے گھر کا اندھیرا نہ مٹا سکتا ہے۔ یہ کہہ کر ویشیا نے محفل لگا دی اور دُوسرا گانا شروع کر دیا۔ گوتم پرشاد کو گیان ہو گیا۔ اُسے لگا کہ سریتا ہی سب سے خوبصورت ہے۔ وہ اُس کی بیوی ہے۔ گھر کی روشنی ہے۔ وہ بھاگا.......

مگر جب گھر پہنچا تو حیران ہو گیا..... کیونکہ اُسے معلوم ہو گیا کہ سریتا بیراگن بن کر چلی گئی ہے۔

***

درمیان میں وہ

ہزاروں لڑکے جوان تھے اور اُن کی آنکھیں بھی ایک دُوسرے کو محبت کی دعوت دے رہی تھیں۔ مگر گوراں کو نہ جانے کیوں دھنیش ہی پسند آیا اور اُسے اچھا لگنے لگا۔ بات آگے بڑھنا شروع ہوئی، درختوں پر پھول کھلے۔ گوراں خوش ہوئی۔ اُسے لگا کہ یہاں پر ہر چیز جینے کے لئے جینا چاہتی ہے، آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ مگر ایک دِن وہ پھول مرجھا گئے تو گوراں پریشان ہوئی۔ پھر اُس نے سوچا کہ پھول دوبارہ کھلیں گے۔ وہ اُن کے کھلنے کا اِنتظار کرنے لگی۔ اِس طرح زندگی کے دن گزرتے ہی گئے۔

''محبت کی منزل کیا ہے......؟'' ایک دن دھنیش نے گوراں سے پوچھا۔

''محبت کی منزل محبت ہے۔'' گوراں نے جواب دیا۔

دھنیش ایک شریف ماں باپ کا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ سورج پرکاش کپڑے کی دوکان کیا کرتا تھا۔ وہ غریب مزدور جن کو باگڑی کہا جاتا ہے، اُنہیں کپڑے بیچتا تھا۔ گارے وا اینٹوں کا کھیل کھیلنے والے یہ مزدور اُس سے کپڑا خریدا کرتے تھے۔ نہ کوئی قیمت کا جھگڑا نہ ریٹ لسٹ کا، بس جسم کی بناوٹ کے مطابق لوگ کپڑے خریدتے اور

وہ اُنہیں بیچتا۔ اس لئے ایک سلسلہ چل رہا تھا۔ غریب عورتیں یہ کپڑے صرف سردی اور گرمی سے بچنے کے لئے ہی نہ پہنتیں تھیں بلکہ اس لئے بھی' کیونکہ اُنہیں ہوس بھری نظروں سے بچنا ہوتا تھا۔ ہر مزدور کی بیوی کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اُسے تو خوبصورت لگے مگر کسی دُوسرے کو نہ لگے اور خوبصورت نہ بھی ہو تو اچھی بات ہے کیونکہ کبھی کبھی زیادہ خوبصورت بیوی بھی اِنسان کے لئے مصیبت کی وجہ بن جاتی ہے۔

دفتر میں بیٹھے ہوئے اِنسان کا خیال گھر کے اندر بھٹکتا رہتا ہے۔ کوئی اگر اُس کی بیوی سے بات کر رہا ہو تو اُس کی نظریں ہمیشہ اُس پر ہوتی ہیں۔ سورج پرکاش اُن غریبوں کو ساڑھیاں بیچتا تھا۔ نہ کوئی جھگڑا نہ کوئی لڑائی۔ غریب عورتوں کے جسم اِتنے خوبصورت ہوتے ہیں کہ اُنہیں ہر کپڑا اچھا ہے' اُن پر ہر کپڑا اچھا لگتا ہے۔ مگر ایک دن خوبصورت عورت کے پاس کچھ پیسے کم تھے۔ اُس نے کم کپڑا خریدنا چاہا تو اُس نے کپڑا اپھاڑا اور اُس مزدورن نے وہ لیا۔ درمیان والی جگہ سے وہ ننگی ہوگئی کیوں کہ پیسے شاموٗ جو کہ اینٹوں کے بھٹے کا مالک تھا' نے دینے تھے۔ اُن کے جسموں پر کپڑے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اِنسانی جسموں کا کپڑوں سے تعلق برسوں سے ہے۔

جسموں کے کپڑے جیسے حیا آنکھوں کا کپڑا' شرافت زبان کا۔ مگر یہ بات عجیب ہے کہ ہر آدمی عورت کی درمیان والی جگہ ننگی دیکھنا چاہتا ہے اور یگ بیتنے کے بعد بھی ایسا ہے۔ اور لگتا ہے کہ یہ سب کچھ زمین کے ساتھ ہی پیدا ہوا اور اس کی موت بھی زمین کے ساتھ ہی ہوگی۔

سورج پرکاش کچھ نہ کہہ سکا مگر اُسے یوں لگا کہ جیسے ہر عورت بیچ میں ننگی ہے اور یہ ننگا پن اِنسان کی آنکھوں میں بس گیا ہے۔ زمین لاکھوں ٹن کپاس اُگلتی ہے' فیکٹریاں لگی ہوئی ہیں مگر بدقسمتی سے عورت کے بیچ والا جسم ننگا ہے۔ دھنیش کے دِل پر گہرا اثر ہوا۔ وہ بازار گیا۔ اُس نے کپڑوں کی لیریں اکھٹی کیں اور اُن کو جلا ڈالا۔ دُھواں اُٹھا' اُس دھوئیں میں اُسے سماج کے چہرے کالے نظر آئے۔ مگر ایک دُوسرا

واقعہ بھی ہوا۔ وہ یہ کہ سورج پرکاش کی دوکان ایک شہر کے نامی ڈاکٹر نے خرید لی، جس کے جج دوست تھے، وکیل دوست تھے۔ سورج پرکاش پر ایک مقدمہ ہوا۔ وہ مقدمہ جس سے اُس ڈاکٹر کو کوئی فائدہ نہ تھا۔ سب ججوں نے سوچا کہ اگر ڈاکٹر مقدمہ ہار گیا تو اُن کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ مقدمہ آگے بڑھا۔ دوکان خالی ہوگئی اور دھنیش نے ہتھیار رکھے اور ملزم بن گیا۔ کیوں کہ اُس کی بہن کی شادی ممکن نہ تھی۔ وہ خاموشی سے یہ سب برداشت کرتا رہا۔ مگر ایک ہتھیار رکئی اور ہتھیار اُٹھواتا ہے۔ اِس بات کی سمجھ شاید اُسے نہیں تھی۔ ادھر نارائن جو کہ اُس کے بچپن کا ساتھی تھا، اُس کا دُشمن بن گیا تھا۔ نارائن بھی یہی کام کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی دُوسرا آدمی یہ کام نہ کرے یا کرے تو اُس کے نیچے۔ مگر جرم کرنا نارائن کا شوق تھا۔ وہ کسی مجبوری کے تحت ملزم نہ بنا تھا۔ بلکہ اُس کی زندگی کا مقصد جرم کرنا تھا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اُسے جرم کرتے ہوئے بڑا مزا آتا تھا اور وہ دِن رات جرم کے بارے میں ہی سوچتا رہتا تھا۔ اُدھر دھنیش بھی جرم کی دُنیا کا بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ ہر شخص اُس سے ڈرنا شروع ہوگیا تھا۔ دھنیش تنگ آگیا کیونکہ جرم کی دُنیا میں نارائن اُس سے آگے نکل رہا تھا۔ ایک دن اُس نے گوراں سے کہا کہ ''نارائن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

اُس نے دھنیش سے کہا۔ ''نارائن بھی اُسے دیکھتا رہتا ہے۔''

یہ سن کر اچانک دھنیش نے اُسے کہا ''تم نارائن سے محبت کی پینگ بڑھاؤ، بس تمہارا یہ کام ہے.......''

''مگر۔'' اُس نے کہا۔

''اگر مجھ سے محبت ہے تو ایسا کرو۔ کیونکہ اِس کے بعد سے اگر مگر کچھ نہیں اور یہ ہی تو سچی محبت کا امتحان ہے۔'' گوراں پریشان ہوگئی۔

اُسے خیال آیا کہ دھنیش صرف اس کا عاشق ہی نہیں بلکہ ایک خطرناک مجرم بھی ہے اور اس کے ماں باپ گھر میں اکیلے اور بوڑھے ہیں۔ اُوپر سے اُس کی ایک

بہن جوان ہے۔ وہ سیدھی گئی اور نارائن کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور پھر نارائن بھی اُس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس طرح سے ایک سلسلہ قائم ہونے لگا۔ ادھر دھنیش نے اسے اپنا سارا مقصد بھی بتا دیا۔ اُس نے کہا کہ اُسے نارائن سے از حد محبت کرنی ہے اور اپنے جال کے اندر پھنسانا ہے اور اُن کا مقصد صرف نارائن کی جان لینا ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہ ہے۔ اُسے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ وہ سیدھا نارائن کے پاس چلی گئی اور وہاں اُسے اس سے محبت کی پینگ ہر حال میں بڑھانی تھیں کیونکہ ایسا کرنا دھنیش کا حکم تھا۔ اُس نے وہی کیا جو دھنیش نے اُسے کہا تھا۔

وہ دن رات محبت کی باتیں کرنے لگی اور اس نے یوں ظاہر کیا جیسے نارائن سے اُسے از حد محبت ہے۔ آخرکار زندگی کا سفر آگے بڑھنے لگا اور بڑھتا ہی گیا اور دھنیش بھی اُسے کبھی کبھار ہی ملتا۔ دھنیش اِس انتظار میں ہے کہ جب گوراں پر نارائن کو پورا یقین ہو جائے یعنی کہ اُس کی محبت پر یقین ہو جائے تو وہ ہر حال میں اُسے بولے گا کہ ایک دن اُسے ڈاکٹر ناڑ کی کوٹھی پر لاؤ اور وہاں وہ اُسے جان سے مار دے گا۔ کیونکہ ڈاکٹر ناڑ پر گو قتل کا الزام تو نہ آئے گا مگر یہ بات تو طے ہے کہ ڈاکٹر ناڑ بدنام ضرور ہوگا۔ کیونکہ ڈاکٹر ناڑ ہڈیوں کا ڈاکٹر ہے اور کافی مشہور بھی ہو گیا ہے' اِس لئے ڈاکٹر کرتار کو اُس سے جلن ہے۔ ڈاکٹر کرتار نے اُسے پچاس ہزار روپے ڈاکٹر ناڑ کو بدنام کرنے کے لئے دیئے تھے۔ دھنیش بھی سمجھتا تھا کہ گو ڈاکٹر ناڑ اِتنا بُرا نہ ہے مگر ایک بات تو سچ ہے کہ کچھ مریضوں سے زیادہ پیسے لیتا تھا۔ اس لئے اُسے اِتنی سزا تو ملنی ہی چاہئے۔

نارائن کا دِل جرم کرتے کرتے پتھر کا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اُسے کسی بھی صورت میں اُس سے بدلا لینا تھا۔ وہ اس لئے نہیں کہ اُسے اُس سے کوئی دُشمنی تھی بلکہ صرف اس لئے کہ وہ جرم کی دُنیا کا اکیلا بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ وہ اپنے میدان میں صرف خود کو ہی آگے دیکھنا چاہتا تھا' کسی

اور کو نہیں۔ بس اس طریقے سے سلسلہ قائم رہا۔ ایک دن اُس نے گوراں کو بلا کر کہا۔

''مجھے دھنیش سے بدلہ لینا ہے۔ تم جاؤ اور اُس کے ساتھ محبت کا ڈرامہ کرو۔

جب مکمل طور پر وہ تمہارے قابو میں آجائے تو اُسے سیر کے بہانے باغ میں لے آنا' مجھے وہاں پر اُس کا قتل کرنا ہے۔''

وہ یہ سُن کر حیران ہوگئی..........

ایک طرف دھنیش کھڑا ہے' جس نے اُسے نارائن کے پاس بھیجا ہے تاکہ وہ اُس کو اپنے جال میں پھنسائے اور پھر وہ اُس کا قتل کر سکے۔ دُوسری طرف نارائن کھڑا ہے جو ایسا ہی کرنے کو کہہ رہا ہے اور دونوں کے درمیان وہ کھڑی ہے۔

***

تپسیا کرتے ہوئے اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ درخت، ہوا اور جنگلی جانور سب ایک ساتھ جیتے ہیں۔ کئی برس بیت گئے۔ پہلے اُس نے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر تپسیا کی، پھر دُوسری ٹانگ۔ پھر اُس کے بعد اُس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور گیان کی تلاش میں نکل پڑا۔

ایک ٹانگ کے بل پر کئی دِن وہ چلتا رہا اور گھومتا رہا۔ آخر ایک دِن اُس نے ایک دریا کے کنارے سب جانوروں کو پانی پیتے ہوئے دیکھا۔

اُس نے دیکھا کہ سب جانور آئے اور پانی پی کر چلے گئے۔ اُس نے ایک جانور سے پوچھا ''تم لوگ آرام سے آئے اور پانی پی کر چلے گئے۔''

''تو اِس میں کون سی خاص بات ہے؟''

''تم نے ایک دُوسرے کو جھپٹا نہیں؟''

''نہیں اُس وقت ہمیں صرف پیاس لگی تھی، بھوک نہ لگی تھی اور پانی ہم آرام سے پیتے ہیں کیونکہ ہم سب اکٹھے بیٹھ کر پانی پی سکتے ہیں۔''

''تم لڑتے کب ہو؟ ایک دوسرے کو مارتے کب ہو؟''

''جب ہمیں بھوک لگتی ہے۔'' اُن کا یہ جواب سن کر اُسے یوں لگا کہ دُنیا کے تمام فلسفے ان ہی لفظوں کے اندر ہیں۔ اُسے لگا کہ اُس کی تپسیا کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ وہ جنگل سے واپس آیا۔ وہ بھی اُس کا اِنتظار کر رہی تھی۔ ''گیان کیا ہے؟'' اُس نے پوچھا۔ ''جان لینا۔'' ''جانتا آدمی کس سے ہے؟'' ''علم سے۔'' مگر علم ہی زِندگی کے لئے سب سے بڑا ڈر ہے۔ آؤ ہم موت کو بھول کر جئیں۔ یہ نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ایک اچھی زِندگی کے لئے موت کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک اچھی زِندگی میں موت کا ڈر نہ ہو۔ ''اِن باتوں کو چھوڑو۔'' وہ سیدھا اُس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''تم میرا اِنتظار کر رہی ہو، لو اب میں آ گیا ہوں''۔ اُس کے جواب میں فوراً اُس نے کہا ''تمہارے آنے میں مزا نہ ہے' کیونکہ جو مزا اِنتظار میں آ رہا تھا' وہ ملن میں نہ ہے.......''

اِنتظار خود ہی ایک مقصد ہونا چاہئے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ ٹھیک ہو گا کہ خود ہی ایک مقصد ہے۔ پھر اُس نے کہا ''جب تم نظر آ رہی ہو تو میں تجھے ہر حال میں حاصل کر کے ہی دم لوں گا۔'' ''اِس سے بھی کچھ نہ ہو گا کیونکہ یہاں حاصل کر کے بھی کچھ حاصل نہ ہوتا ہے۔'' اُس نے پھر کہا ''میں تجھے بلا شرط حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' اُس کا جواب سن کر وہ حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔

''مگر حاصل کرنا کیا ہوتا ہے۔ ایک دُوسرے کو پا لینا۔ مگر ہمارا وجود تو ایسا ہے کہ ہم ایک اِنچ بھی اِس زیادہ کچھ نہ بڑھ سکتے ہیں۔ ہاتھ کی اُنگلیاں پانچ سے بڑھ کر چھ نہ ہو سکتی ہیں.......''

پھر ایک آواز آئی۔ ''کھیل جیتو'' ......پھر یہ تمہیں ہر حال میں مل جائے گی۔ سورج کی روشنی آتی گئی اور سات رنگوں میں بکھرتی گئی۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ جو سامنے ہے وہ نظر نہ آتا ہے اور جو نظر آتا ہے وہ سامنے ہے اور پھر سامنے کا پیچھا ہے اور پیچھے

کا سامنا ہے۔ پھر اُس نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'' تم کھیل جیت کر ہی مجھے حاصل کر سکتے ہو۔''

مگر اُس نے پھر کہا'' یہ سچ ہے کہ میں تمہاری باہوں میں آنا چاہتی ہوں اور یہ بھی سچ ہے کہ ایسا کرنے سے وجود پگھل جائے گا۔''

مگر اُن کی باتوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ ناچ شروع ہو گیا اور ساتھ میں گانا بھی۔ لوگ ناچنے لگے اور جسموں کا میلہ شروع ہو گیا اور خواہشوں کا بازار گرم ہو گیا۔ پھر ڈھول کی آواز آئی۔ اگر اُسے باہوں میں لینا چاہتے ہو تو اِس ناچ کے کھیل کو جیتو کیونکہ ایسا کرنے کے بغیر تم کھیل نہ کھیل سکو گے اور نہ ہی تم اُسے اپنی باہوں میں لے سکو گے۔ اُس سے یہ ملن کے لئے ضروری ہے۔ وہ اِس قدر اپنی خواہش کا غلام ہو چکا تھا کہ اُس کی سوچ کو نہ جانے کیا ہو گیا۔ اب کھیل کھیلنے کے بجائے وہ جیت اور ہار کے چکر میں پھنس گیا اور پھر اُس کے بعد کھیل کا مقابلہ شروع ہو گیا اور کئی گھنٹوں تک کھیل چلتا رہا۔

اب اُس کا مقابلہ ایک بوڑھے کے ساتھ تھا۔ کیونکہ کس کا مقابلہ کس کے ساتھ ہوگا اِس کا فیصلہ ڈھول کی تال کرتی ہے۔ کھیل کھیلتے ہوئے اُس کی سانس پھول گئی۔ جسم لہولہان ہو گیا۔ لوگوں نے زور کی تالیاں بجائیں۔ اُسے لگا کہ وہ شاید یہ کھیل جیت گیا ہے۔ اُس کے جسم پر ہار ڈالے گئے' سینٹ بھی پھینکا گیا۔ مگر ججوں کے مطابق اُس کا کھیل برابر کا نہ تھا اور بوڑھے کا لحاظ لازمی تھا۔ پھر اُسے کئی برس تک اور تپسیا کرنی پڑی۔ وہ بھی اُس کے سامنے کھڑی رہی۔ پھر کئی برس تک ایک ٹانگ کے بل پر کھڑے ہو کر اُس کا بدن چھلنی ہو گیا تھا اور لہو کی رفتار بھی کم ہو گئی۔

پھر اُسے حاصل کرنے کے لئے اُس نے کھیل شروع کیا۔ ناچ شروع ہو گیا۔ اندھیرے میں اپنے ساتھ ناچنے کے لئے اُس نے ساتھی بھی ڈھونڈ لیا۔ مگر کئی نیگ ناچنے کے بعد پھر ججوں کا فیصلہ اُس کے خلاف گیا۔ کیونکہ اس بار پھر مقابلہ

برابر کا نہ تھا۔ اُس کا ساتھی ایک بچّہ تھا۔ اس لئے اب کی بار وہ جیت کر ہار گیا۔ اُسے حاصل کرنے کے لئے کھیل میں جیت حاصل کرنا ضروری تھا۔ بس ایک اسی بات پر ہر چیز کا فیصلہ ہو جاتا۔ مگر اب کی بار اُس نے کہا کہ ملنا ہمارا مقدر نہ ہے۔ کیونکہ ملنے کے بعد تم نہ رہو گے' میں نہ رہوں گا' بس کھیل جاری رکھو ایک دُوسرے کے چاہنے کی چاہ میں جیتے رہو اور زمین سے سبق لو' جو ہمیشہ سورج کے گرد گھومتی رہتی ہے اور دن اور رات کا مزا لیتی ہے۔ اُس نے کبھی دن اور رات کو ایک کرنے کی کوشش نہ کی ہے۔

***

لوگ، لوگ ہیں

دِلشاد نہ جانے کیوں ہر مزار پر دِیے جلانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ صرف مزاروں پر ہی نہیں دِلوں کے اندر بھی دِیے جلاؤ اور ہر دِل کے اندر دِیا جلنا چاہئے۔ دِلشاد کبھی ایک خوبصورت نوجوان ہوا کرتا تھا۔ چلتا تھا تو لگتا تھا جیسے ہوا بَل کھا کر چل رہی ہو۔ بات کرتا تو جیسے پھُول اپنی پتیاں بکھیر رہے ہوں۔ ہاتھ اُس کے جیسے خوبصورت جھرنوں اور پھُولوں کی مالاؤں کا سفر ہو۔ مگر اب وہ چل نہیں سکتا۔ اُس کے ہاتھ کلائیوں سے زخمی ہو گئے ہیں اور وہ ایک آنکھ سے اندھا ہو گیا۔ اُس کا پیٹ اب کھانا ہضم نہیں کر سکتا، گھر والے اُسے چھوڑ چکے ہیں۔ اب وہ جگہ جگہ گھومتا ہے اور زور زور سے کہتا ہے۔

''دِیے جلاؤ، دِیے جلاؤ۔ یہ خُدا کا پیغام ہے اور وہ لفظ جو اِس پیغام کو ظاہر کرتے ہیں، وہ بھی روشنی کے دِیے ہیں اور اِن میں پیار اور محبت کا تیل ڈالو۔''

دِلشاد بھی عام لڑکوں کی طرح ہی جوان تھا۔ گھر میں بُوڑھا باپ تھا، ماں تھی اور دو بہنیں۔ ہر روز صُبح وہ اسکول جایا کرتا تھا اور پڑھنے میں اُس کا دِل خوب لگتا تھا۔ مگر

اُس کا کچھ وہاں پر تھا جسے کچھ لوگ آزاد کشمیر کہتے تھے اور کچھ مقبوضہ کشمیر۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کشمیر کتنا خوبصورت ہے۔ جھرنوں سے لدا ہوا ہے اور پنچھی جب چہکتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کوئی گیت گا رہے ہوں۔ پھر اُس پر یہ لفظ تو اس کے نام کو بھدا کرتے ہیں، نہ جانے کس نے لاد دیئے۔

وقت آگے بڑھا۔ موسم بدلے۔ اُس کی آنکھوں کے اندر ایک چمک آ گئی۔ وہ بارہویں جماعت میں چلا گیا۔ پڑھائی میں خوب اُس کا دِل لگتا تھا۔ ساتھ کے گھر والے اُس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اُس گھر کے ساتھ گلشن نام کی لڑکی بھی جوان ہوئی تھی۔ پھر وہی ہوا جو ہوتا آیا ہے......... ایک دِن معلوم ہوا کہ دِلشاد کی ماں بوڑھی ہوگئی ہے۔ اب اُس کے ہاتھوں میں طاقت نہ رہی ہے کہ وہ لسی کو چھیل کر مکھن نکال سکے۔

.... کے لئے ہوئے ہیں۔ گُلشن کے باپ نے کہا۔

گاؤں کے لوگ لسی اور روٹی کھانا پسند کرتے تھے اور پھر جب اِسے وہ تمبرو کی چٹنی کے ساتھ کھاتے تو مزا ہی کچھ اور آنے لگتا کہ مکّی کی روٹی اُنہوں نے تپسیا کر کے حاصل کی ہے۔ گرم گرم روٹی، ٹھنڈی لسّی اور تمبرو کی چٹنی جب کھاتے تو لگتا ہے کہ سورج کی کرنیں اُنہیں چُوم رہی ہوں۔ مکھن وہ بیچتے اور اُس سے اُنہیں کپڑوں اور دال کے لئے روپے ملتے۔

مکھن کی وہاں پر ایک خاص اہمیت ہے۔ جب کسی کی خوبصورتی کو بیان کیا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ وہ اِتنا گورا ہے جتنا مکھن۔ یہاں کے بچے روپے پیسوں کی چوری نہیں کرتے بلکہ مکھن کی چوری کرتے ہیں۔ لاکھوں روپیہ پڑا رہے، ہیرے پڑے رہیں، اُنہیں یہ لوگ بے کار کی چیزیں سمجھتے ہیں۔ مگر مکھن جیسے جنت سے آئی ہوئی خوراک ہے جو کسی نے لسّی میں مِلا دی ہو۔

جب دُلہن گھر میں آتی ہے تو اُس کا سواگت مکھن سے کیا جاتا ہے۔ جب

کسی مہمان کو کھانا کھلایا جاتا ہے تو مکھن سے روٹی چوپڑی جاتی ہے۔ مکھن لسّی سے نکلتا ہے، لسّی دہی سے بنتی ہے اور دہی دُودھ سے اور دُودھ گائے اور بھینسیں دیتی ہیں۔ سردیوں میں اِن جانوروں کو کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور رات کو گھاس جلا کر گرمی پیدا کی جاتی ہے۔ کئی غریب لوگ تو گھاس میں رات گزار کر جانوروں کو اپنے کپڑوں میں سُلاتے ہیں۔

گُلشن دِلشاد کے گھر آ کر مکھن نکالنے لگی۔ جب لسّی کو چھیلتی اور چھلتی تو لگتا کہ کوئی پری ہے۔ اُس کے خوبصورت چہرے پر جب لسّی کے چھینٹے پڑتے تو محسوس ہوتا جیسے چاند کے چہرے پر سورج کی روشنی کے ٹکڑے ڈالے گئے ہوں۔

دِلشاد اُسے دیکھتا اور دیکھتا ہی جاتا۔ جب گُلشن مکھن کو اِکٹھا کرتی تو لگتا کوئی چاند کی روشنی کے گولے بنا کر زمین پر بھیج رہا ہو، جہاں صِرف کالی راتیں ہی رہتی ہیں۔ دِلشاد کو لگا کہ اُس کی اندھیری راتوں میں شاید کوئی روشنی کے دِیے کی سلائیوں سے سُوراخ کر رہا ہو۔

اب روز گُلشن آتی اور مکھن نکالتی اور دِلشاد اُسے دیکھتا ہی جاتا۔

بات آگے بڑھی اور محبت تک آ پہنچی......

اِدھر گُلشن اپنے گھر کا مکھن سپاہیوں کو بیچتی۔ چونکہ مکھن کی کوئی سرحد نہ ہے اِس لئے گُلشن کو بھی سرحد کی اہمیت معلوم نہ ہے۔ وہ راجہ نام کے فوجی کو مکھن بیچتی۔ راجہ اُس کے عوض اُسے کو روپے دیتا...... پھر راجہ نے گُلشن کو کپڑے دینا شروع کئے۔ خوبصورت کپڑے، حسین کپڑے اور ایسے کپڑے دیتا جن میں گُلشن خوبصورت دِکھائی دیتی، بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ اور خوبصورت دکھائی دیتی۔

اصل میں راجہ کو کمو نام کی لڑکی سے بہت پیار تھا۔ کمو جوان تھی اور حسین تھی۔ مگر راجہ کے پاس اُن دِنوں روزگار نہ تھا۔ کمو کا باپ اِنتظار نہ کر سکتا تھا۔ کمو کی شادی کر دی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ راجہ بعد میں فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اب اپنی محبت کا اِظہار

وہ گُلشن کو خوبصورت کپڑے دے کر کرتا اور کپڑے اِس قدر دِلکش دیتا تا کہ گُلشن راجہ کو اچھی لگے اور دِلشاد اُس سے اور پیار کرے۔ دِلشاد کو گاؤں کی ہر چیز سے پیار تھا۔ درختوں کے پتوں سے، خوبصورت پھولوں سے، جھرنوں سے، گاؤں کے پرندوں سے، جانوروں سے۔ وہ ایک نہایت ہی رحم دِل اِنسان تھا۔

کیپٹن حیات نیا نیا وہاں پر آیا تھا۔ اُس کی ڈیوٹی لوگوں میں نفرت پھیلانا تھی اور ایسے نوجوان تیار کرنے کی تھی جو نفرت کے ستون بن سکیں۔ مگر دِلشاد شاید اِس کے لئے تیار نہ تھا۔ ایک دِن حیات نے گاؤں کے جھرنے کو گندا کر دیا مگر دِلشاد نے اُس سے کچھ نہ کہا، صرف پانی صاف کر دیا۔ ایک دِن حیات نے گھاس کو آگ لگا دی۔ دِلشاد نے آگ بجھا دی مگر اُسے کچھ نہ کہا۔ مگر ایک دِن اُس کی گائے کو قتل کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر دِلشاد اُس کے پاؤں پڑ گیا اور کہنے لگا۔

''مجھے مار دو مگر میری گائے کو کچھ نہ کہو کیونکہ اُس کی موت کے بعد میری ماں مرجائے گی........''

حیات اب پریشان ہو گیا۔

ایک دِن اُس نے گُلشن کو دُوسری طرف مکھن دیتے ہوئے دیکھ لیا۔ غُصّے میں آ کر اُس نے فائیر کیا۔ پھر دونوں طرف سے فائیرنگ ہوئی مگر اُس روز یہ خوش قسمتی تھی کہ کوئی بھی نہ مرا۔ جب آفیسروں کی میٹنگ ہوئی تو سارا بوجھ مکھن پر پڑا۔ مکھن لگا کہ گندا ہو گیا ہے اور فوجی وردی کے سخت کپڑے نے اُسے چوس لیا۔ راجہ کو جھوٹھو ہو گیا ہے اور وہ تبدیل کر دیا گیا۔ اُس سے کیونکہ یہاں بھی کیپٹن نہار ہر روز تنگ تھا کہ گُلشن ہر روز صرف راجہ کو ہی مکھن دیتی تھی۔ لہٰذا نہار نے بھی حیات کی حمایت کی۔ یہ حمایت دونوں ملکوں میں دوستی بڑھانے کی وجہ سے نہیں کی گئی مگر اصل وجہ وہ جلن تھی جو حیات اور نہار کے دِل میں گُلشن اور راجہ کے لئے تھی۔ حالانکہ سچائی یہ تھی کہ راجہ اور گُلشن کا پیار سچا تھا اور اِس پیار میں راجہ کی یہ خواہش تھی کہ اُس کے دیئے ہوئے کپڑوں میں وہ

خوبصورت لگے تا کہ دِلشاد اُسے زیادہ چاہے۔ یہ ایک عجیب قسم کی محبت تھی۔ نہار گلشن کے جسم کو نچوڑنا چاہتا تھا مگر راجہ گلشن کے جسم کو سجانا چاہتا تھا۔

یہ بھی سچائی ہے کہ گلشن اور راجہ کا رِشتہ مکھن اور لسّی کی طرح تھا جو دہی میں جب ایک ہوتے ہیں تو اُن کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ مگر جب اپنا وجود ظاہر کرتے ہیں تو الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ دِلشاد کو جھرنوں سے پیار تھا۔ وہ آسمان کو چاہتا تھا۔

جب حیات تنگ آیا تو اُس نے دِلشاد کو آہستہ آہستہ یہ بتانے کی کوشش کی کہ سرحد کے اُس پار گلشن کی طرح کی لڑکیوں کی عزت لوٹی جاتی ہے۔ اُس نے گلشن کی محبت کا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔

پھر اُس نے کہا کہ اُس طرف مسجدوں میں نماز نہیں پڑھنے دی جاتی اور اُسے جنت میں پریاں ملیں گی اگر اُن لوگوں سے وہ کشمیر آزاد کرایا جائے جو لوگوں کو نماز نہیں پڑھنے دیتے، جو عورتوں پر ظلم کرتے ہیں۔ پھر اُس نے اُسے یہ بھی یقین دِلایا کہ اُس طرف کے کشمیر کو آزاد کرانا ہی اِسلام ہے۔

دِلشاد نوجوان تھا۔ ابھی پوری طرح ڈاڑھی مُونچھ بھی نہیں آئی تھی اور حیات ایک منجھا ہوا کھلاڑی۔ اُس نے آہستہ آہستہ دِلشاد کے دِل میں نفرت بھرنی شروع کردی۔ مگر عجیب بات تو یہ ہے کہ دِلشاد کو بہتے جھرنوں، پھُولوں اور پرندوں سے محبت تھی مگر آہستہ آہستہ یہ محبت نفرت میں بدلنے لگی۔ اُسے جھرنے کا میٹھا پانی کھارا محسوس ہونے لگا۔ پھُول ایک بے وجہ سی چیز نظر آنے لگے اور گلشن کے بجائے وہ گلشن کے بدن کو چاہنے لگا۔ اُسے حاملہ عورتوں سے نفرت ہونے لگی۔ اُسے پرندوں کی آواز ایک بے وجہ شے نظر آتی۔ اُسے لگا کہ جھرنے دھرتی کو ورگڑ رہے ہیں اور بھینسیں دُودھ نہیں بلکہ زہر دیتی ہوں۔ امن کا گیت گانے والا دِلشاد جنگلی نغمے پسند کرنے لگا۔ دلشاد اُس کی باتوں میں آ گیا اور نفرت سے بھرپور گھر بنانے میں مصروف ہو گیا، مگر ابھی تک نفرت پُورا گھر نہ بنا سکی تھی۔

''گلشن کے بارے میں کبھی نہ سوچنا۔ یہ عورت ذات اِنسان کو اپنا مقصد کبھی بھی پورا نہیں کرنے دیتی۔'' کیپٹن حیات ہمیشہ دِلشاد سے یہ کہتا رہتا۔

مگر گلشن نے ایک دن دِلشاد کو بتا دیا۔'' حیات کی آنکھوں میں زہر ہے' نفرت ہے اور وہ اُس کی عزت لوٹنا چاہتا ہے۔''

اُس رات وہ سویا نہیں۔ غُصے میں گھومنے لگا' اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ نیچے اُتر گیا۔ مگر یہاں کا ماحول دیکھ کر وہ کافی حیران ہو گیا۔

نیچے ایک خوبصورت قصبہ تھا۔ اُس دن شاید دیوالی تھی۔ مندروں اور لوگوں کے گھروں میں دِیے جل رہے تھے اور گھروں کے اندر گائتری مندر کا پاٹھ ہو رہا تھا...... ''اوم شانتی شانتی......'' وہ سمجھ گیا کہ زمین پر شانتی کے لئے دُعا مانگی جا رہی ہے۔ سارے شہر میں روشنی ہی روشنی ہے۔ اُس نے ایک دِیا جلایا۔ اُسے لگا کہ وہ روشنی میں اضافہ کر رہا ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے دِل کے اندر ایک روشنی نے جنم لیا ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ دِیے جلانے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ اُسے اِس بات کا پتہ لگ گیا کہ اصل میں گلشن کو حاصل کرنے کے لئے حیات نے سب کچھ کیا ہے۔

اُس نے پھر دِیے جلائے اور مندروں میں شنکھوں کی آواز سُنی' مسجدوں میں اذان سُنی۔ وہ رات بھر گھومتا رہا۔ لوگوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اُسے گلشن کی یاد آئی اور آہستہ آہستہ پہاڑی کے اُوپر چڑھنے لگا۔ وہ کچھ بدلہ بدلہ سا تھا۔ اُسے بہتے ہوئے جھرنوں کو دیکھنے میں مزا آنے لگا۔ درختوں کے چلنے کی آواز اُسے یوں لگی جیسے کوئی سنگیت چھیڑ دیا گیا ہو۔ اُسے ہتھیاروں سے نفرت ہونے لگی۔ اُس نے ہتھیار پھینک دیئے اور آہستہ آہستہ سرحد پار کرنے لگا۔

کیپٹن حیات کو سب معلوم ہو چُکا تھا۔ جوں ہی اُس نے سرحد پار کی' زور زور سے پُکارنے لگا۔ ''گلشن..... گلشن.......''

مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ گلشن تو مر گئی تھی۔ حیات نے اُسے پکڑ لیا۔ اُسے

بہت مارا گیا کہ بتاؤ اُدھر کے راز کیا ہیں؟ پھر اُس سے پوچھ تاچھ کی گئی۔ ایک آنکھ نکال دی گئی' ہاتھ توڑ دیئے گئے' پاؤں زخمی کر دیئے گئے۔ کچھ دیر کے بعد حیات کا تبادلہ ہو گیا۔ مگر وہ اب کہتا پھرتا ہے۔

''دِیئے جلاؤ۔ دِیئے جلانے میں مزا آتا ہے......علم کی روشنی' ادب کی روشنی پیدا کرو اور گلے مِلو۔ اِدھر کے لوگ' اُدھر کے لوگ کچھ بھی نہیں۔ لوگ' لوگ ہیں۔ ایک ہی طرح سے محبت کرتے ہیں' نفرت کرتے ہیں۔ ایک ہی طرح کے درختوں کے پھل کھاتے ہیں۔ پھولوں کی مہک کا مزا بھی ایک ہی طریقے سے لیتے ہیں اور پانی کا مزا بھی اُنہیں ایک ہی طریقے سے آتا ہے۔''

***

امرانا ایک نام ہے۔ رِشتوں میں بندھا ہوا' تعلقات مین اُلجھا ہوا۔ جو ہر بات کو سمجھتی ہے مگر دُنیا کو اُسے بتانا ہے کہ وہ کچھ نہ سمجھتی ہے۔ وہ بول سکتی ہے اور ہر ظلم کے خلاف چیخ سکتی ہے۔ مگر اُسے دُنیا کو بتانا ہے کہ وہ گونگی ہے۔ وہ سن سکتی ہے مگر دُنیا کو بتانا ہے کہ وہ بہری ہے۔ رِشتوں کی آنکھیں اپنے جسموں سے باہر نکل کر امرانا کے بدن کو ٹٹول رہی ہیں اور پھر جب سُسر کے پاؤں پڑی تو اُس کی اُنگلیاں بدن سے الگ ہو کر اُس کی خوبصورتی پر خراشیں مارنے لگیں۔ اُس کی عمر لوگوں کے مطابق پچیس برس ہے۔ مگر حقیقت مین وہ اِس دھرتی کی اصل باسی ہے۔ کیونکہ برہما کے بعد جو شکتی پیدا ہوئی' وہ وہی تھی' وہ وہی ہے' جو اگر نہ ہوتی تو اوتار و پیغمبر نہ آتے۔

اُس کا بدن دھرتی کی طرح یگوں سے اِنسان کی ہوس و لالچ کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے۔ اُس کے بچے جب اُس کی چھاتیوں سے دُودھ پیتے ہیں' تو لگتا ہے کہ دیوتا گنگا جل کا اشنان کر رہے ہیں۔ امرانا کسی ایک جسم کا نام نہیں ہے۔ بلکہ جذبے کا نام ہے۔ ماں کے رِشتے کا نام ہے۔ جو درد سہہ کر اِس دُنیا کے نظام کو چلاتی ہے۔ اپنی کوکھ میں بھگوان کی دُنیا کو چلانے کے لئے اِنسان کو رکھتی ہے۔ پالتی ہے' تڑپتی ہے'

گرمی میں جلتی ہے، سردی میں ٹھٹھرتی ہے، کہیں آگ میں جلائی جاتی ہے، وہ بھی زندہ۔ اور کہیں زِندہ دفنائی جاتی ہے۔

ہوس بھرے بدن اُس کے بدن کو صدیوں سے نچوڑتے ہیں اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مر کر بھی نہیں مرتی۔ اُس کا سبھاؤ زمین کی طرح ہی ہے۔ جس طرح اِس پر لگے ہوئے درخت کاٹے جاتے ہیں۔ اِس کے پاس پانیوں کو گندہ کیا جاتا ہے۔ مگر زمین زِندگی کا نظام چلانے کے لئے یہ سب کچھ برداشت کرتی ہے۔ ٹھیک اُسی طرح امرانا ہر دُکھ کو سہہ کر جیتی ہے۔

حالانکہ اُس کے خوبصورت جسم کو ہوس بھری نظریں چھیڑتی رہتی ہیں اور اِنسان چاہتا ہے کہ اپنی سانسوں کے ذریعے اُس کے بدن کے کپڑے اُتارے۔ مگر پھر بھی اپنی کوکھ میں اُس مرد کو رکھتی ہے، جو اُس کی کوکھ سے امرانا کو ہی مٹانا چاہتا ہے۔ چاہتا ہے کہ دُوسری امرانا جنم نہ لے۔ یہ بھول کر کہ یہ امرانا ہی ہے جس کی کوکھ میں یہ سارا سنسار رہتا ہے۔

امرانا کے جسم کی بے عزتی کی جاتی ہے۔ پیٹ بڑھنے پر اُس کی ہنسی اُڑائی جاتی ہے۔ مگر دھرتی کے نظام کو چلانے کے لئے وہ سب برداشت کرتی ہے۔ اِس کے بغیر دُنیا، دُنیا نہ ہے۔

جیسے آتما کے بغیر جسم صرف ایک لوتھڑا ہے۔ اِسی طریقے سے اس کے بغیر یہاں کچھ نہ ہے۔

وہ جہاں جہاں بھی ہے دُوسروں کی خدمت کرتی ہے، بچے جنتی ہے۔ اور جب اُس کا پیٹ بڑھتا ہے تو اپنے اُوپر ہونے والے جُملوں کو برداشت کرتی ہے۔ ''موٹی ہے، پیٹ بڑھا ہے، اگلی بار مجھ سے بڑھوانا، بڑا مزا آیا ہوگا یہ سب کراتے ہوئے۔'' پھر تڑپتی ہے جب پیٹ بڑا ہوتا ہے۔ مٹی کھاتی ہے۔ عظیم درد برداشت کر کے اِنسان کو جنم دیتی ہے اور اِس دُنیا کا کارواں چلاتی ہے۔ وہ ننگی نہ رہے، درختوں

کے پتے ہمیشہ اُس کے ننگے بدن کو ڈھانپنا چاہتے ہیں۔ پانی اُس کے بدن کے ساتھ لپٹنا چاہتا ہے۔ اُسی سے لگتا ہے کہ قدرت کے ساتھ آج بھی اُس کا رشتہ پرانا ہے۔

امرانا یہ سب کچھ سہتے ہوئے جیتی رہی اور آگے بڑھتی رہی۔ وہ اُن شمشان گھاٹوں میں نہ مر سکی جہاں اُسے جلایا جاتا تھا۔ اُن قبرستانوں سے باہر آ گئی جہاں اُسے دفنایا جاتا تھا۔ اُس نے اِتنے خوبصورت بدن رچائے تاکہ آتما کا پرماتما سے مِلن ہو جائے۔ پھر اُس کا نام جب دروپدی تھا' وہ کوروؤں کے دربار میں لائی گئی اور ننگی کی گئی۔ وقت کے دھرت راشٹر نے اپنے آپ کو اندھے ہونے کا اعلان کر دیا اور سب سے کہا کہ وہ پاپ مکت ہو گیا ہے کیونکہ اندھا ہے۔ پانڈوؤں کے دھنش بے کار ہو گئے اور پھر جب امرانا بنی تو مریادا میں بندھی تھی۔ اُسے سچ نہ بولنا ہے۔ سچ بولنے سے رِشتے ٹوٹنے کا خطرہ رہتا ہے۔ ہر دور کا راجہ اُس کے جسم کو دیکھتا ہے۔ مگر جب اُس کے لڑکے اُسے ننگا کرتے ہیں تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔

مگر کلجگ میں وقت بدلا۔ کوئی کرشن نہ تھا' کوئی اوتار نہ تھا۔ لٰہذا وہ بول اُٹھی' چیخی' اُس نے زور سے کہا ''میرا ابلاتکار ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ میرے بچوں کے سامنے ہوا۔ اُس وقت میں جب ننگی ہوئی تھی' میرے بچے نہ تھے۔ اب میرے بچے ہیں۔ اُس وقت میرا سُسر اندھا تھا مگر اب کی بار میرے سُسر کی آنکھیں ہیں۔ اُس نے آنکھیں کھول کر مجھے پہچانا' پھر میرا بدن نچوڑا۔'' اُس نے یہ بھی یاد کیا کہ اُس کے سُسر نے یہ تعلیم عام کی تھی کہ اُس کا سُسر یہ کر ہی نہیں سکتا اور اُس نے یقین کر لیا۔ اور اس یقین کے بعد وہ اُس کے کمرے میں جانے لگی۔ اُس کے پاؤں دبانے لگی۔ اصل میں اسی کا فائدہ لے کر اُس کے سُسر نے اُس کی عزت لُوٹ لی۔ جب دریودھن نے بھیشم پتامہ سے کہا تھا کہ مریادا میں بندھا ہے اور وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔ مگر اس بار مہابھارت ہوئی تھی اور سزا دوشاسن کو مِلی تھی اور اُن تمام لوگوں کو جنھوں نے دھرت راشٹر کا دربار رچایا تھا۔ مگر اب کی بار سُسر نے اُس سے یہ کہا کہ وہ مریادا میں بندھا ہے۔ یہ غلطی

امرانا کی ہے۔ اب کی بار اس نے فیصلہ دھرت راشٹر کے حق میں ہوا اور امرانا حرام ہوگئی۔ ''ممی حرام ہوگئی''، ''ممی حرام ہوگئی۔'' اُس کے بچوں نے کہا۔ اُس کے گھر میں سورج کرنوں کے ذریعے گیا۔ مگر وہ یہ سب کچھ خاموشی سے محسوس کرتا رہا۔

امرانا نے محسوس کیا کہ وہ بے بس ہے۔ اُس کے بچوں نے سنا کہ ماں حرام ہوگئی ہے۔ اب کیا کیا جائے۔ حرام کے ایک لفظ سے ہزاروں سلسلے ٹوٹ گئے۔ ہزاروں قافلے لُٹ گئے اور پھر ماں کے ساتھ بچے بھی تو حرام ہو گئے۔ گھر گھر میں چرچا ہوا اور اُس کا خوب پرچار ہوا۔ محلے میں اِس چیز کا ذکر ہوا۔ کیا سُسر بہو کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے......؟

تمام بہوؤں نے دروازے زور سے بند کر دیئے اور رات کو سُسر سردی سے ٹھٹھرنے لگے۔ مگر بہوؤں نے دروازے نہ کھولے۔ صبح دُھوپ میں اِن کو چائے ملنا بند ہوگئی۔ اس کا اثر اور رِشتوں پر بھی ہوا۔ جن رِشتوں کو بچانے کے لئے کئی جنگیں لڑیں گئیں تھیں، وہ ٹوٹتے ہوئے نظر آنے لگے۔ لگا کہ مہابھارت کی لڑائی ایک فضول کی لڑائی تھی اور کربلا کی اِس زمین پر کوئی ضرورت نہ تھی۔ گھروں کے تمام نظام درہم برہم ہونے کا ڈر پیدا ہوگیا۔

کُتے بھونکے، پرندے چہکے۔ گویا کہہ رہے ہوں، ہم احتجاج کریں گے تمہارے لئے۔ کیونکہ ہمارا کوئی مذہب نہ ہے۔ اِس لئے ہمیں کسی کا ڈر نہ ہے۔

امرانا کے سُسر نے اُس کو دھمکی دی اور کہا کہ رِشتہ امرانا نے توڑا ہے۔ مگر امرانا بول پڑی۔ پرندے چہکے، جانور غرائے۔ امرانا نے کہا'' کیوں ایسا ہو رہا ہے۔ صدیوں سے ہو رہا ہے۔ مگر اب کی بار میں یہ سب برداشت نہ کروں گی، نہ سہوں گی۔''

آخر وہ ہر طرح سے ہار گئی اور ہارنے کے بعد اور پریشان ہوئی۔ یگوں کے بعد بھی عورت کا کوئی گھر نہ ہے۔ وہ ماں باپ کے گھر سے نکالی جاتی ہے۔ طلاق دے کر، صرف تین لفظ کہہ کر وہ سُسر کے گھر سے نکالی جاتی ہے۔ وہ گڑگڑائی مگر اُس کا

کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُس کا اپنا کچھ بھی نہ ہے۔ یہ سُسر کا گھر ہے یا باپ کا اور وہ نہ سُسر کی بن سکتی ہے اور نہ باپ کی۔ وہ تو مر چکی ہے۔ اُسے مرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔ اُس کی شادی تو ہوئی ہی نہ ہے اور وہ عورت جو اپنے آپ کو سماج کی عزت.... کہتی تھی، وہ تو چکلے میں رہتی ہے۔ اُس کے ماں باپ نہ ہیں۔ اُس نے اعلان کیا اور تمام عورتوں کو اکٹھا کیا کہ اب ہم بچے پیدا نہ کریں گی۔ جُلوس نِکالا۔ تمام دُنیا حیران ہو گئی۔ اب کیا ہوگا؟ یہ تو سارا نظام ہی ختم ہو جائے گا۔

یہ سب جان کر لگا کہ اب یہاں پیغمبر اوتار بھی اس دُنیا میں نہیں آئیں گے اور لڑکیوں نے سوچا کون بچے کو پیٹ میں رکھ کر طعنے سُنے۔ پھر درد سہہ کر، بچے کو جنم دے کر دُنیا کے نظام کو چلائے اور پھر بے عزتی کرائے، یہ نہ ہو سکے گا۔

تمام مذہبی کتابوں کے اوراق گھبرائے۔ جب نئے اِنسان ہی پیدا نہیں ہوں گے تو پھر سورگ اور نرک کے فلسفے کی اہمیت ہی ختم ہو جائے گی۔ مذہبی کتابیں ختم ہو جائیں گی۔

ایک تصّور کائنات میں اُبھرا، دریا اور پہاڑ بھی پریشان دیکھے گئے۔ لوگ پریشان ہوئے۔ وہ امرانا کے سُسر کے پیچھے بھاگے۔ لوگوں نے اعلان کیا کہ ہم اُس کے سُسر کو مار کر ہی دم لیں گے، ختم کر دیں گے۔ وہ ایک بچے کی طرح بھاگا اور امرانا کے پاس آ گیا۔ ایک بچے کی طرح سسکنے لگا۔

امرانا نے اُسے اپنے آنچل میں سمالیا۔ لوگ پریشان ہوئے اور امرانا کے پاؤں پڑنے لگے۔ امرانا نے کہا۔ ''مجھے دیوی کا نہیں عورت کا درجہ دے دو۔ مجھے جینے دو، یہ سمجھ کر کہ مجھے بھی جینے کا حق ہے اور اِتنا اعلان کرو، جہاں میں رہتی ہوں وہ میرا گھر بھی ہے....''

***

زمین کی ضرورت

کچھ بھی نہیں ہوا اور بہت کچھ ہو گیا۔ بستی کے تمام لوگوں کو بیماری لگ گئی۔ اُن کے پاؤں ٹیڑھے ہو گئے۔ یہ بات کچھ بھی نہ تھی مگر پریشانی کا عالم بڑھتا ہی گیا۔ بات یہاں تک آ پہنچی کہ سماج کا وجود ہی ختم ہوتا نظر آنے لگا۔ دُلہنوں پر بدکردار ہونے کے اِلزام لگائے گئے کیوں کہ پاؤں ٹیڑھے ہونے کی وجہ سے وہ دُوسروں کی چارپائیوں پر جانے لگیں۔ لوگوں نے راستوں کو ٹیڑھا کرنا شروع کیا کیوں کہ سیدھے پاؤں ٹیڑھے راستوں پر چل نہ سکتے تھے۔ مگر ہاتھ بھی ٹیڑھے ہو گئے۔ اِس لئے مسئلہ اور خراب ہو گیا۔ اگر کہیں پاؤں ٹیڑھے تھے تو راستہ سیدھا اور جہاں راستہ سیدھا کیا گیا وہاں پاؤں ٹیڑھے ہو گئے۔ گویا کہ ہر چیز اُلٹی سمت چلنے لگی۔ اصل میں سارے جسموں کے حصّے ہی اِدھر اُدھر ہو گئے اور ایک نیا تضاد کا شکار ہو گیا۔ لوگ بے شمار کھانا کھاتے مگر اُن کے پیٹ خالی رہتے۔ پانی پینے کے باوجود پیاس تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ بات اور آگے بڑھی۔ کوئی اگر کسی کے حق میں دُعا کرنے کی کوشش کرتا تو منہ سے گالی نکلتی اور گالی دیتا تو منہ سے دُعا نکلتی۔ جس کو پھانسی دینی چاہئے تھی لفظ اُس کے لیے ''بری''

نکلنے لگے اور جسے آگ میں ڈالا جانا تھا اُس کے لیے حکم ہوا کہ اُسے خوبصورت پھولوں والے باغ میں پھینکا جائے۔ کڑوی دوائی میٹھی ہونے لگی اور ہر وقت افراتفری مچ گئی۔ مگر اتنی دیر میں ایک اور آواز بھی بلند ہوگئی۔ سائیں ناتھ پھکڑ آیا ہے اور وہ اپنے وعدے کے مطابق بستی میں آ گیا ہے۔

وہ پچاس برس پہلے اِس بستی سے چلا گیا تھا اور اُسی سنجیونی بوٹی کی تلاش میں گیا تھا، جسے کھانے کے بعد لوگ جب تک چاہیں زندہ رہ سکیں۔ اُس نے پہاڑوں پر جا کر بے حد تپسیا کی۔ کئی دِن تک بھوکا رہا، ننگا رہا، سردی کو برداشت کرتا رہا اور پھر گرمی کو بھی برداشت کرتا رہا۔ جنگلی جانوروں سے بھی اپنے بدن کو کٹواتا رہا۔ آخر اُس کی آنکھوں میں ایک طاقت آئی۔ یہ طاقت ہاتھوں پر زخم کھانے اور سینے میں درد سہنے کی عوض آئی۔ اُس کو معلوم ہوا کہ یہ گھاس پھوس ہی سنجیونی بوٹی تھی مگر بد قسمتی سے وہ پہچان نہ سکا تھا۔ حالانکہ سچائی یہ بھی ہے کہ ایک اور عظیم راز کے بارے میں بھی اُسے معلوم ہوا کہ آسمان ضرور اُن کی مدد کرتا ہے جو زمین سے پیار کرتے ہیں۔ یہاں ہر چیز کا ایک دُوسرے سے تعلق ہے۔ اور پھر اندر سے ایک اور سلسلہ بھی چل رہا ہے جس کو دیکھنے کے لیے آنکھوں کو بھی تپسیا کرنی پڑتی ہے اور ننگے بدنوں سے ہٹنا پڑتا ہے۔ اور اُن جسموں کو دیکھنا پڑتا ہے جو زخمی ہیں اور ہاتھوں کو ہدایت دینی پڑتی ہے کہ وہ اوروں کے زخموں کا علاج کریں۔ اُن گھروں میں بھی جائیں جہاں لڑکیوں کو پیدا ہونے سے روکا جاتا ہے۔ لوگوں کو وہ یہ بھی سمجھا کر گیا تھا کہ پہاڑ اُن کو چوٹ نہیں پہنچاتے جو پانیوں کو گندہ نہیں ہونے دیتے۔ جو بچوں کے آنسو پونچھتے ہیں اُنھیں کبھی پیٹ درد نہیں ہوتا اور یہ بھی سچ ہے کہ پھولوں کی خوشبو اُن کے ہاں دوگنی ہو جاتی ہے جو درختوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

مگر وہ یہ جان کر حیران ہو گیا کہ گلاب کے پھولوں کا رنگ کنول پر ہے۔ اور گُٹھے کی خوشبو نرگس کے پھولوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ بہن بھائی کے رِشتے بھی شرمندہ

ہو گئے ہیں۔ سب لوگوں کی رنگت ہی تبدیل ہوئی ہے۔ لوگ اُس کے اِردگرد اکٹھے ہو گئے۔ ایک نے کہا۔ "بابا بچاؤ۔"

دُوسرے نے کہا۔ "اِنسانی جسموں کی ترتیب ختم ہوگئی ہے۔ ہمارا کوئی حل نِکالو بابا کیونکہ ہم مر بھی نہیں سکتے.........جب مرنے کی کوشش کرتے ہیں تو جینے کی دُعا نکلتی ہے۔"

"یہ کوئی مسلۂ نہ ہے۔ جن کے خون گندے ہو گئے ہیں' اُن کا علاج پہلے کرتا ہوں۔" بابا نے کہا۔

"ٹھیک ہے....." بھیڑ نے کہا۔ کیونکہ یہ سب بیماریوں کی وجہ خون ہی ہے اور خون صاف ہو جائے تو چہرہ بھی صاف ہو جاتا ہے اور دل بھی صاف ہو جاتا ہے اور پھر اس صفائی میں جینے سے جو زِندگی کا مزہ آتا ہے' اُسے دیوتا بھی ترستے ہیں۔

لوگ دوڑے۔ مگر سائیں ناتھ نے صرف اِتنا کہا۔ "جن کے خون گندے ہو گئے ہیں' جاؤ..... یہاں سے پچاس فٹ دور تین گز نیچے ایک دریا بہتا ہے' جس کے پانی میں یہ خوبی ہے کہ وہ خون صاف کرتا ہے۔" لوگ دوڑے۔

پھر بابا نے کہا "جن کے جسم آگے پیچھے ہو گئے ہیں' وہ تین میل کی دُوری پر جائیں۔ وہاں پر ایک زرخیز زمین ہے وہاں کے پھولوں کی پتیوں کو نچوڑنے سے ایسا رس پیدا ہوتا ہے جو جسم کی ترتیب کو ٹھیک کرتا ہے۔" یہ سُن کر لوگ دوڑے۔ پھر نوجوانوں نے کہا کہ اُن کی آنکھیں دیکھتی کچھ اور ہیں مگر نظر کچھ اور آتا ہے۔ اِس لئے گرنا' ٹھوکریں کھانا اُن کا مقدر بن گیا ہے۔ سائیں ناتھ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اُن کا بھی علاج بتایا۔ کہا کہ "جاؤ پگڈنڈیوں پر' اُن لڑکیوں کو دیکھو جو اُس ندی سے پانی بھر کر لاتی ہیں جن کے کنارے عورتیں بیٹھ کر کپڑے دھوتی ہیں۔ مگر یاد رکھنا' اُنھیں دیکھنا چھونا نہیں۔"

ایک دُوسرا شخص بھی وہاں پر آ گیا جس کا ناک پیٹ کی جگہ آ گیا تھا' اور کان

پاؤں پر چلے گئے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی بابا نے رحم کھایا اور کہا" جاؤ گلاب کے پھولوں کی خوشبو کو سُونگھو۔ تمہارا ناک ٹھیک ہو جائے گا۔" اِس پر اُس لڑکے نے پوچھا۔" بابا یہ گلاب کیا ہوتا ہے؟ یہ پھول کیا ہوتے ہیں......؟ سائیں ناتھ یہ سُن کر حیران ہو گیا اور اُس نے اُسے اُس باغ کا پتا بتایا جہاں پر پھول ہوتے ہیں۔ ابھی وہ مشغول ہی تھے کہ ایک شخص وہاں پر آ گیا اور آتے ہی سائیں ناتھ کے پاؤں پڑ گیا۔

"بابا میری بھی مدد کر...."

"کیا ہوا ہے تمہیں؟ میری بیوی بچے جننے سے اِنکار کر رہی ہے۔ کہتی ہے کہ ایسا کرنے سے درد ہوتا ہے۔" سائیں ناتھ نے سوچا کہ ایسا ہوا تو ایک وقت یہ ساری دُنیا ہی ختم ہو جائے گی۔ اِس پر سائیں ناتھ نے اُس سے کہا۔" یہاں سے دُور یعنی تین میل دُور، پہاڑ کی آخری چوٹی سے تھوڑا پہلے، ایک ایسی چوٹی آئے گی جس پر نیلے پیلے رنگ کی ایک ایسی مٹی ہے جس کے اندر وہ بیج رہتے ہیں جنہیں سونگھنے سے عورتوں کو بچہ جنتے ہوئے تکلیف نہیں ہوتی، بلکہ مزہ آتا ہے۔" یہ سُن کر وہ خوش ہوا اور اُن بیجوں کو لانے کے لئے بھاگ گیا۔

پھر ایک عورت وہاں آئی اور کہنے لگی کہ" میرا بچہ میرے پیٹ کے بجائے پیٹھ میں چلا گیا ہے۔" اِس پر سائیں ناتھ بابا نے کہا۔" گھبرانے کی کوئی بات نہ ہے وہ شخص جو بوٹی لائے گا، اُس سے تمہارا بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

سائیں ناتھ لوگوں کو اپنی کہانی سُناتے ہوئے کہنے لگا.......

"میں ایسی بوٹی کی تلاش میں گیا تھا جسے کھانے کے بعد اِنسان مر نہ سکے، مگر ایسا نہ ہو سکا مگر میری یہ تلاش کامیاب ہو گئی ہے۔ ایسے نسخے لایا ہوں کہ اِنسان درد کے بغیر جی سکے۔ اب خوبصورت جسم بڑھاپے میں بھی خوبصورت اور حسین رہیں گے اور واسنا کی خواہش اُس تیاگ میں تبدیل ہو گی جہاں پر ایک ایسا مزہ آتا ہے جو انسان کی سوچ کے باہر ہے۔" مگر ایک عورت نے جھٹ کہہ دیا۔" مہاراج اب اِس کا کوئی

فائدہ نہ ہے۔'' سائیں ناتھ نے حیرانگی سے پوچھا۔''اب یہ لوگ جینے کا مزہ کھو چکے ہیں۔ ہوا' سورج سے اُن کی دوستی ختم ہوگئی۔ ایک دُوسرے کے گھروں کے دِیئے بجھا بجھا کر سورج سے اُن کی دُشمنی ہوگئی ہے۔ اُنھیں پھولوں کے دیکھنے میں مزہ نہ آتا' اُنھیں توڑتے ہیں' اِس لیے خوشبو اُن کے گھروں سے بھاگ گئی۔''

سائیں ناتھ یہ سب سُن کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔ اِتنی دیر میں وہ لوگ واپس آئے جنھیں اُس نے دریا سے پانی لانے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ پانی پینے کے بعد اُن کا خون صاف ہو سکے۔ اُن میں سے ایک نے کہا ''مہاراج غضب ہو گیا۔''

''کیا ہوا....؟ سائیں ناتھ نے پوچھا۔ آپ سے جھوٹ بولا گیا۔ مجھ سے اور جھوٹ بولا گیا' ہاں یہ سچ نہ ہو سکتا ہے مگر ہوا کیا' وہاں کوئی دریا نہ ہے۔ ایک سڑک ہے جس کے دونوں طرف کے گڈھوں میں گندگی کا ڈھیر ہے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ ابھی اس پریشانی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ لوگ بھی واپس آگئے جن کو زرخیز زمین کے پتے لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

مہاراج ظلم ہو گیا آپ کو بھی جھوٹ بولنا پڑا۔ ہم زرخیز زمین کی تلاش میں گئے تھے اور پیچھے سے ہمارے گھروں میں چوری ہوگئی ہے۔ وہاں پر کوئی زمین نہ ہے بلکہ ایک کلب بنا ہوا ہے۔ سائیں ناتھ کو لگا کہ اُس کی آنکھوں کی روشنی کم ہو رہی ہے اور سُننے کی طاقت بھی دھیمی۔ وہ شرمندہ تھا اور پریشان بھی۔ وہ اِتنا شرمندہ ہوا کہ اُسے اپنے آپ کو سائیں ناتھ کہنے پر بھی شرم ہونے لگی۔

اِتنی دیر میں دو لڑکے واپس آگئے جو پگڈنڈی سے گزرتی ہوئی پانی کا گھڑا سر پر اُٹھائے' مٹک مٹک کر چلنے والی لڑکیوں کو دیکھنے کے لیے گئے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ حضور وہاں پر ایک تالاب ہے جس میں لڑکیاں ولڑکے ناچتے ہیں مگر دونوں کے بدن ایک جیسے ہیں۔ اس لئے معلوم ہی نہ ہو سکتا ہے کہ لڑکیاں کون ہیں۔ پھر اُس نے آتے ہی شور کرنا شروع کر دیا جو اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ مٹی لائے جس کو کھانے کے بعد

عورتوں کو بچہ جننے میں مزہ آتا ہے۔ وہ آنے ہی نہیں لگا۔'' مہاراج وہاں پیشاب کرنے والی جگہ بنی ہے اور بدبو آتی ہے۔'' سائیں ناتھ یہ سن کر اور پریشان لگا۔

اور اُس نے اعلانیہ کہا۔'' تم گھر کے دوست ہو' محلوں وشہروں کے دوست ہو' مگر دُشمن ہو۔ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک بچے کی رونے کی آواز آئی جو ابھی پیدا ہوا تھا کہ کہہ رہا ہو زمین کا میری ماں کی کوکھ سے گہرا تعلق ہے۔ اِس لیے زمین بچاؤ تا کہ میں پیدا ہو کر جیوں۔ کیونکہ چلنے سے پہلے میرا گھسیٹی کرنا ضروری ہے اور گھسیٹی کرنے کے لیے زمین چاہئے۔

***

دُوسری سوچ

لوگوں کے گھروں میں کام کرتے کرتے اُس کا بدن تقسیم ہو گیا تھا۔ کسی گھر میں اگر ہاتھ اچھے طریقے سے کام کرتے تو دُوسرے گھروں میں پاؤں۔ کسی گھر میں پورا جسم بھی کام کرتا تھا۔ سامنے والی پڑوسن کے برتن گھر درے تھے اور سخت بھی اور لوگ تھوکتے بھی ان میں تھے۔ سب کی صفائی لازمی تھی۔ اِس لئے یہاں اُس کے ہاتھ پیارے تھے اور پھر دُوسرے گھر میں بہت کمرے تھے۔ یہاں بھی سب کی صفائی لازمی تھی۔ اِس لئے یہاں اُس کے پاؤں پیارے تھے۔ اور تیسرے گھر میں رہنے والے کی بیوی مر چکی تھی اور بچے چاہتے تھے کہ اُن کا باپ دُوسری شادی نہ کرے' اِس لئے یہاں اُس کا جسم پیارا تھا۔ وہ بٹ گئی تھی اور اُس کے بچے بھی بٹ گئے تھے۔ دال اگر ایک گھر کی کھاتے تو چاول دُوسرے گھر کے اور سبزی تیسرے گھر کی۔ غریب اِنسان کا بدن بٹا ہوا رہتا ہے مگر اُس کی رُوح ہمیشہ قائم و دائم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ محبت کی تلاش میں ہوتی ہے' پھر گوپالنی بھی تو تقسیم ہو کر رہ گئی تھی۔

کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ گوپالنی کا گھر والا ایک مزدور تھا۔ اُن کا ایک چھوٹا سا گھر تھا اور گھر کے اندر ایک چھوٹا سا آنگن۔ اُس آنگن میں نہ جانے کیوں بہت سبزی پیدا ہوتی تھی۔ وہ سبزی ہی اُن کا گزارہ تھا۔ بس ایک بیج اور سینکڑوں پھل۔ اور جو اُسے ہر روز کی مزدوری کا روپیہ ملتا اُس سے اُن کے گھر کا گزارہ چلتا تھا۔ وہ اُسی سے اپنے ماں باپ کی سیوا کرتا تھا۔ اِسی طریقے سے وقت بیت رہا تھا۔ دو بچے تھے، نہ کوئی شکوہ نہ کوئی شکایت۔

ایک دِن وہ بازار جا رہا تھا کہ ایک جلوس حکومت کے خلاف تھا، بلکہ یوں کہا جائے کہ سخت خلاف تھا اور مہنگائی کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ راجہ ایک دیوار کے ساتھ کھڑا تھا، چپ چاپ۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ حالانکہ یہ جلوس مہنگائی کرنے والوں نے ہی نکلوایا تھا۔ جلوس نکلوانے والے کچھ لوگ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ دیہاڑی داروں کو مستقل کرو۔ اُن میں سے کوئی دیہاڑی دار نہ تھا، وہ غریب نہ تھے۔ پھر ایک شخص نے زور سے کہا۔ ”ریفیوجی مسئلہ حل کرو۔“ گو اُن میں کوئی ریفیوجی نہ تھا۔ غریب تو روٹی روزی کمانے میں مصروف تھے اور جو نعرے لگانے کے لئے اکٹھے کئے گئے تھے وہ لاٹھی و گولی کھانے کو کسی بھی صورت میں تیار نہ تھے اور جلوس کی خبر تب تک نہیں آتی جب تک اُس پر گولی نہ چلے، لاٹھی نہ چلے۔ جلوس لوگوں کو خبر دیتا ہے۔ لیڈروں کو بیان دینے کا موقع دیتا ہے۔ جلوس کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ لڑکپن سے جوانی کی طرف بڑھتی ہوئی لڑکیوں کے جسموں کو چھیڑا جاتا ہے۔ لوگوں کو جلوس میں شامل کر کے اُن کے گھروں میں چوریاں کروائی جاتی ہیں۔ وہ دیہاڑی داروں کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ ریفیوجیوں کے حق میں نعرے لگا رہے تھے اور لوگ یہ نعرے اِس لئے لگا رہے تھے کیونکہ جلوس کے وجود کے لئے ضروری ہیں۔ جلوس آگے بڑھ رہا تھا۔ کچھ لوگ رُکتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پولیس والوں کے اندر ڈر پیدا ہوا کہ کہیں یہ جلوس آگے نہ بڑھ جائے۔ جلوس کے وجود کے لئے وجود

ہی ضروری ہے۔ جلوس میں لاٹھی چلتی ہے' گولی چلتی ہے۔ کچھ پولیس والوں کو میڈل ملتے ہیں۔ جلوس روکنے والے پولیس والوں کا نام آگے جاتا ہے' وہ مشہور ہوتے ہیں۔ اُن کے بیان آتے ہیں۔ مگر جلوس والوں میں لاٹھی گولی کھانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ آفیسر نے دیکھا کہ ایک شخص ڈرا ہوا دیوار کے ساتھ کھڑا ہے اور غریب دکھائی دیتا ہے۔ اُس کے لئے لوگوں نے جلوس نکالا ہے' مگر وہ جلوس میں نہ ہے۔ یہ نعرے اُس کے لئے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے وہ نعروں کا حصّہ نہ ہے اور یہ سارا سلسلہ جب آگے چلنے لگا تو جلوس کو ڈرانے کے لئے گولیاں چلیں اور خبر بنانے کے لئے ایک گولی راجہ کو مار دی گئی۔ ایک معمولی سا واقع رُونما ہوا کہ راجہ مرگیا۔ بھاگنے والوں کو موقعہ مل گیا۔ خبر ڈھونڈنے والوں کو خبر مل گئی۔ لیڈروں نے خوب مذمت کی۔ پولیس والوں نے ضروری بتایا اور جلوس روکنے کے لئے کچھ لوگوں کی پرموشن کی سفارش بھی کی گئی۔ اگلے الیکشن میں اُس کی موت بھی چناؤ کا مدعا بنی۔ مگر اُس کی بیوی بیوہ ہوگئی' بچے یتیم ہوگئے' ماں باپ بے سہارا ہوگئے۔ اِس کے بعد اُس نے لوگوں کے گھروں میں کام کرنا شروع کیا۔ گھروں سے بچا ہوا کھانا اور سبزیاں بچوں کو کھلاتی تھی اور پھر جب بجلی والا بجلی کا کرایا مانگتا تو بوڑھے ساس سُسر گھر سے چلے جاتے تاکہ اُن کی بہو الگ گھر میں رہ سکے اور جب راشن کا ڈیلر گھر میں آتا' تب بھی وہ ایسا ہی کرتے۔ مگر اِن سب چیزوں سے الگ رہ کر وہ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے میں مصروف تھی۔ ساس سُسر کی خدمت کرنے میں کھوئی رہتی تھی اور یہ سلسلہ درسلسلہ قائم رہا۔ اب تھک گئی تھی۔ کئی برس ہوگئے تھے اور چہرے پر لگاتار کئی جھریاں پڑ گئی تھیں۔ اور سچ یہ ہے کہ ایک وقت میں وہ سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔

پھر ایک دِن راحت کا دِن آیا۔ اُس کے بوڑھے ماں باپ کو پنشن کے کچھ روپے ملے۔ اُس نے ایک دم اُسے بلایا اور پیغام بھجوایا کہ اُسے ضرور ایک دِن کے لئے آنا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئی کیونکہ چار دِن کے لئے کوئی اُسے کوئی کام نہ تھا۔ صبح

اپنی مرضی سے اُٹھنا اور شام کو مرضی سے سونا تھا۔ دِن کو جس وقت چاہے کھانا کھا سکتی تھی اور پھر اپنے ماں باپ کے گھر جہیز کے وہ تمام کپڑے پہن سکتی تھی، جو ابھی خراب نہ ہوئے تھے۔ اگلے روز صبح اُس نے اچھا سوٹ پہن کر پھر تیاری کی اور بچوں و ساس سُسر سے کہا کہ میں چار دِن کے بعد آؤں گی۔ بوڑھے سُسر نے حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ بیٹی، چار دِن کے لئے آرام کرو۔''

اِن ہی خوابوں کے ساتھ وہ تیار ہوئی تھی۔ اُس نے ایک تانگہ کیا اور اپنے میکے کے گھر چلی گئی۔ جوں ہی گھر کے دروازے کے قریب پہنچی اُسے دھکا لگا کہ اُس کا بھائی اپنی بیوی یعنی کہ اُس کی بھابی سے کہہ رہا تھا۔

''گھبراؤ مت، مجھے معلوم ہے کہ تم کام کرتے کرتے تھک گئی ہو۔ میری بہن آرہی ہے، وہ لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہے، اُسے کام کرنے کا خوب تجربہ ہے۔ چار دِن وہ سارے کام کرے گی۔ تم آرام کر لینا۔ اگر ہو سکا تو سینما دیکھنے بھی جائیں گے۔'' یہاں پہنچ کر وہ یہ جان کر حیران ہوگئی کہ یہاں تو سوچ ہی دُوسری ہے۔

***

ایک اور ہجرت

شمبو ناتھ ۱۹۸۹ء میں جوان تھا اور اُس کی نئی نئی شادی بھی ہوئی تھی۔ شادی سے پہلے ایک چھوٹی سی نوکری بھی لگ گئی تھی۔ پہلی تنخواہ لیتے ہی اُس نے کچھ روپے جمع کرنے کے لئے الگ رکھ دیئے تا کہ ڈل کے کنارے ایک مکان بنا سکے۔ لگتا ہے کہ سارا کشمیر ڈل کے گرد گھومتا ہے۔ ایک دِن یہ خبر آئی کہ ڈل کی زمین پر لوگوں نے قبضہ کیا ہے۔ اُس روز خدا بخش بیمار ہو گیا۔ بات اور آگے بڑھی۔ خبر آئی کہ ڈل بالکل گندی ہو گئی ہے۔ اُس روز خدا بخش مر گیا۔ مگر نہ جانے کیوں اُس کی آنکھیں اُس وقت کھلی ہوئی تھیں۔ گویا پیغام دے رہی ہوں کہ ڈل کو بچالو۔ اِسے صاف کرو۔ اس پر قبضہ مت ہونے دو۔ اِسے ڈل کے پانی کی طرح صاف رکھو اور رِشتوں کی کشتیاں چلنے دو اور خواہشوں کے عوض زِندگی کے حسین لمحوں کا سفر خوبصورت پانی پر جاری رکھو۔ ڈل کے صاف پانی میں چاند کا چہرہ اور زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ چونکہ ڈل گندی ہو گئی تھی اور اِسے ایک عام واقعہ سمجھا گیا تھا۔ ٹھیک اُسی طرح خدا بخش کی موت کو بھی ایک عام واقعہ سمجھ لیا گیا تھا۔ مگر برف ضرور کچھ میلی نظر آئی تھی اور اُس روز سورج کی روشنی زیادہ گرم ہوتی ہوئی معلوم ہوئی تھی۔

ڈل کے کنارے مکان بنانے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ ڈل سے سورج ڈھلنے کا نظارہ کچھ الگ قسم کا ہوتا ہے اور پھر ڈل کے اُوپر بھگوان شو یعنی شنکر آچاریہ کا مندر بھی ہے۔ شمبو ناتھ اِس بات کو جانتا تھا کہ اُس کا ہر روز مندر جانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ مگر جینے کے لئے یہ احساس ہی کافی ہے کہ اُس کے اُوپر بھگوان کا سہارا ہے کیونکہ شمبو ناتھ اپنے گناہوں کے بارے میں جان گیا تھا۔

شمبو ناتھ ایک سرکاری دفتر میں معمولی سا کلرک تھا۔ مگر اپنے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کی خواہش کے لئے اُسے رشوت کھانی پڑتی تھی اور ساتھ میں وہ اپنی بیوی کو اچھے کپڑے بھی پہنانا چاہتا تھا' جو اُس کے لئے معمولی تنخواہ سے ممکن نہ تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اِنسان کے جرم و گناہ کی وجہ اُس کی خواہشیں ہیں۔ جہاں جرم سے بچنے کے لئے قانونی خامیوں کا سہارا ضروری ہے۔ اُسی طرح گناہ سے بچنے کے لئے بھگوان کا سہارا ضروری ہے۔

یہ سب ایک عجیب سلسلہ ہے۔ شمبو کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور نئی نئی شادی کی خواہشیں بھی کچھ نئی نئی ہوتی ہیں۔ نئے نئے رِشتے دار' نئے نئے تعلقات' نئے نئے سلسلے۔ ایک نئی خواہش شمبو ناتھ کے دِل میں مکان بنانے کی ضرور ہے مگر ساتھ میں پُرانے گھر کو سجانے سنوارنے کی خواہش بھی ہے۔

مگر اُس کی بیوی ایک نیا گھر بنانا چاہتی ہے۔ شمبو کا باپ فقیر چند اُنہیں کہتا کہ وہ نیا گھر بنائیں ضرور مگر رہیں اُس کے ساتھ اِسی گھر میں۔ کیونکہ وہ کسی بھی صورت میں اپنے گھر کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا' کیونکہ اُسے اپنے اُس گھر کی حفاظت کرنی ہے' جو پُرانا ضرور ہے مگر جس میں اُس کے بزرگوں کے لگائے ہوئے اخروٹ کے درخت ہیں اور یہ ہی اخروٹ اُس کے مطابق کشمیر کی پہچان ہیں۔ اور ساتھ میں اُسے کیسر کے کھیتوں میں کام کرنا ہے کیونکہ اُس کے مطابق کشمیر اِس لئے خوبصورت ہے کہ یہاں پر کیسر ہے اور کیسر اِس لئے سُہانا ہے کیونکہ کشمیر میں اُگتا ہے۔

پھر یہاں کے اخروٹوں کی حفاظت اِس لئے بھی ضروری تھی کیونکہ انسانی نسل اس دُنیا میں شاید اسی زمین سے شروع ہوئی تھی اور کلیان والی وہ رات، جب برف والے بابا نے زہر پی کر دُنیا کو امرت دیا تھا، یہیں سے نمودار ہوئی تھی اور زِندگی کی علامت تھی۔ کہنے کو تو وہ رات تھی مگر وہ رات سورج کے آرام کی رات تھی۔ ساری روشنی اپنے اندر سمو کر وہ خوب سویا تھا اور چاند اُس رات کو ناچا تھا۔ ڈل کا پانی امرت بنا تھا اور زمین سے درخت اُگے تھے، جن پر اخروٹ لگے تھے۔ سب لوگوں نے خوش ہو کر شوراتری منائی تھی اور اخروٹوں کا پرشاد بانٹا تھا۔

شمبو اُس کھیل کے میدان کو دیکھا کرتا تھا جس میں بچپن میں وہ گُل نارائن کے ساتھ کبڈی کھیلا کرتا تھا۔ مگر ایک دِن اچانک اُسے لگا کہ شوراتری میں سورج نکل آیا ہو اور اخروٹوں کے درختوں نے خود ہی اپنے اخروٹ گرا دیئے ہوں۔ کیونکہ کشمیر میں اُگرواد پھیل گیا تھا۔ پہلے تو اُسے یقین نہ آیا مگر بعد میں جب موت کا کھیل شروع ہوا تو اُسے کشمیر چھوڑنا پڑا۔ سارا سامان ایک ٹرک میں لاد دیا گیا۔ اُس میں کمروں کو سجانے کے خوبصورت قالین بھی تھے جو جب زمین سے اُٹھائے گئے تو پھٹ گئے۔ لگا کہ جیسے ہجرت کے خلاف اِحتجاج کر رہے ہوں اور برتن بھی ایک دُوسرے سے ٹکرائے اور اُنہوں نے بھی جیسے شور کیا ہو اور کہا ہو "یہ غلط ہے، اِسے مت ہونے دو۔" مگر اُن سب کی آواز سُننے والا کوئی نہ تھا۔

شمبو ناتھ کا سارا کنبہ ٹرک میں یوں بیٹھا جیسے تاریخ کی ایک کتاب کو توڑ موڑ دیا جائے اور ایسے میں اُس کے صفحوں کا تعلق ٹوٹ جائے۔ اُس کے پڑوسی اُسے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اُسے روکیں یا نہ روکیں۔ یہ سوال اُن کے دِل میں اُٹھ رہے تھے کہ اگر وہ اُسے روک بھی لیں تو کیا وہ اُس کی بیوی کی حفاظت کر سکیں گے۔ اُس کی بہن کو اُن ہوس بھری نظروں سے بچا سکیں گے جو کشمیر کا مقدر بن چکی تھیں۔ سب کچھ سامنے سامنے ہو رہا تھا۔ زبانیں تھیں مگر لوگ گونگے ہو گئے تھے۔ پاؤں تھے

مگر لوگ چل نہ سکتے تھے۔ سامان کے ساتھ ہی اُسے ایک کیمپ میں پھینکا گیا۔ ایک ٹینٹ رہنے کے لئے دیا گیا۔ اُس نے جوں ہی آباواجداد کا خوبصورت قالین بچھانے کی کوشش کی تو وہ اور پھٹ گیا۔ برتن نکالے تو ٹوٹ گئے۔ لگا کہ اُنہیں اپنی زمین سے ہی محبت ہے اور اِنسان نہ سہی تو کم از کم یہ تو اِحتجاج کر رہے ہیں۔ قالین پھٹا تو یوں آواز آئی گویا کہہ رہا ہو۔ ''میں اپنی زمین کا ہی قالین ہوں۔''

جب شمبو ناتھ کے گھر کے لوگ دُوسرے لوگوں کے ساتھ ٹرک میں بیٹھے ہوئے تھے اور ٹرک چل رہا تھا تو ایسا لگ رہا تھا جیسے رِشتے شرمندہ ہو رہے ہوں کیونکہ جسم ایک دُوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ مسلے جا رہے تھے۔ کوئی بھی اِحتجاج نہیں کر رہا تھا۔ مگر اِتنا لگ رہا تھا جیسے سیب کے درختوں کے پھول زمین پر گر رہے ہوں اور ڈل میں پانی کم ہو رہا ہو۔

شمبو ناتھ کا باپ فقیر چند، اُس کی ماں شانتی گرمی برداشت کرنے کے عادی نہ تھے اور پھر یہاں رہتے ہوئے ایک عجیب سا ماحول پیدا ہونے لگا۔ مگر اُس کی بیوی اور بہن اِس ماحول میں ڈھلنے لگیں تھیں۔ پھر ایک دِن فقیر چند آم کھانے لگا تو گٹھلی اُس کے گلے میں پھنس گئی۔

اُس نے پہلی بار چپاتی کھائی تو اُس کے مُنہ میں چھالے پڑ گئے۔ مگر زندگی چلنے لگی۔ وقت بیتنے لگا۔ ریڈیو پر واپس جانے کی خبریں آنے لگیں۔ شمبو کے گھر ایک بیٹا بھی پیدا ہوا، جس کا نام دیپک رکھا گیا۔ اور پھر ایک لڑکی نے بھی جنم لیا، جس کا نام پاروتی رکھا گیا۔ وقت اور بیتا۔ دیپک اور پاروتی بڑے ہو گئے تو اُنہیں اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔

یہاں اُنہوں نے اپنے کئی دوست بنائے۔ پھر اُن دوستوں کے گھر اُن کا آنا جانا بھی ہو گیا۔ مگر ایک خاموش تضاد ضرور گھر میں شروع ہو گیا۔ دیپک کو آم کھانے پسند تھے۔ مگر فقیر چند ابھی سیبوں کا ذائقہ نہ بھولا تھا۔ دیپک دال اور چپاتی پسند کرتا تھا،

مگر فقیر چند ابھی کرم اور چاول ہی کھانا چاہتا تھا۔ اور پاروتی بے چاری بیچ میں ہی پھنس گئی تھی کیونکہ جب بھی پاروتی چنے کی دال کے ساتھ ابل کھانے کی کوشش کرتی تو فقیر چند اُسے بیچ میں آ کر ٹوک دیتا اور کہتا کہ "بیٹی تُو کشمیریوں کی بیٹی ہے اور کشمیریوں کے گھر جانا ہے۔" بس اسی ماحول میں وہ سب جی رہے تھے۔ دیپک اور پاروتی جماعتیں چڑھ رہے تھے۔ شمبوناتھ کو اپنی تنخواہ پر گزارا کرنا پڑ رہا تھا۔ اِس دوران کشمیری پنڈتوں پر کئی نظمیں لکھی گئیں اور کئی سیریل بنے۔

دیپک اور پاروتی کے کئی دوست اُن کے گھر اور کئیوں کے گھر وہ جانے لگے۔ اُنہوں نے یہاں کئی سلسلے بنا لئے۔

"میرا دوست نارائین بڑا اچھا آدمی ہے۔" ایک دن دیپک نے کہا۔

"میری سہیلی کوی کی ماں مجھ سے بڑا پیار کرتی ہے۔"

پھر ایک اور بحث شروع ہوئی۔ کئی طرح کی آوازیں آنے لگیں۔

کچھ لوگ کہتے "گھر واپس جائیں گے۔"

کچھ کہتے "نہیں جائیں گے۔"

اِس کشمکش میں اُن کی زندگی گزرنے لگی۔ مگر جوں جوں وقت بیتنے لگا فقیر چند کو اپنے گھر کی یاد ستانے لگی۔ ایک ایک لمحہ وہ یوں بِتا رہا تھا جیسے سیب کے درخت سے سیب گر رہے ہوں۔

اِدھر شمبوناتھ چاہتا تھا کہ چاہے وہ کشمیر جائے، چاہے نہ جائے مگر یہ بات ضرور کہی جاتی رہے کہ اُس نے کشمیر جانا ہے تاکہ اُسے یاد رہے کہ وہ کشمیر سے آیا ہے۔

اِدھر پاروتی اور دیپک بڑھنے لگے۔ اُدھر فقیر چند اور شانتی بوڑھے ہونے لگے۔ فقیر چند کو گھر کی یاد اور ستانے لگی۔ اُس نے اپنے ہم عمر اکٹھے کئے اور ایک کمیٹی بنائی جس کا نام اُس نے "گھر بساؤ کمیٹی" رکھا۔ پھر وہ "گھر بساؤ کمیٹی" کا لیڈر بن گیا۔

فقیر چند نے اشتہار چھپوائے اور اپنے ہم عمروں کے ساتھ ایک جلوس نکالنے

کی تیاری کرنے لگا۔ اُس نے شمبو ناتھ سے کہا کہ کل صبح جلوس نکالنا ہے اور وہ تیار رہے۔ مگر اِدھر پاروتی اور دیپک نے بھی وہ اشتہار پڑھ لیا تھا۔ اُنہوں نے بھی اپنے ساتھ کے لڑکے اور لڑکیاں اکٹھی کر لی تھیں۔ دیپک نے کہا ''پاپا آج جلوس ہے۔ جو ہجرت ہمارے بزرگوں نے کی ہم وہ دوبارہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم نے دیکھ لیا کہ ہجرت کا انجام کیا ہے۔ رِشتے بٹتے ہیں، پیار بٹتا ہے، تعلقات ٹوٹتے ہیں۔''

اِدھر فقیر چند شمبو کو بُلا رہا ہے، اُدھر دیپک بُلا رہا ہے۔ شمبو بیچ میں کھڑا ہے۔ اُسے اپنی نانی کے وہ لفظ یاد آرہے ہیں، بیچ کی بھی اپنی زمین ہوتی ہے۔

***

نام : شیام سندر آنند لہر

وا کانام : شری بلراج آنند

تاریخِ پیدائش : ۲رجولائی ۱۹۵۱ء

مقامِ پیدائش : پونچھ (جموں وکشمیر)

تعلیم : بی. ایس. سی، بی. اے (اُردو) ایل. ایل. بی

مشغلہ : وکالت

تصانیف : نروان (مختصر ڈرامے)

تپسوی کون (طویل ڈراما)

سرحد کے اُس پار (افسانوی مجموعہ)

اگلی عید سے پہلے (ناول)

سرحدوں کے بیچ (ناول)

مجھ سے کہا ہوتا (ناول)

انحراف (افسانوی مجموعہ)

کورٹ مارشل (افسانوی مجموعہ)

سرحدیں (ریڈیائی ڈرامے)

یہی سچ ہے (ناول)

بٹوارہ (افسانوی مجموعہ)

اِنعامات واعزازت : راجستھان اُردو اکاڈمی اِنعام/ اُترپردیش اُردو اکاڈمی اِنعام/ بہار اُردو اکاڈمی اِنعام

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اُردو ڈیپارٹمنٹ اعزاز/ جموں یونیورسٹی اُردو پروفیشنل کورس اعزاز

امریکن بایوگرافیکل اِنسٹی ٹیوٹ کا ''مین آف دی ایئر ایوارڈ'' / میرا اکاڈمی لکھنؤ اِنعام/ پراچین کلا کیندر چنڈی گڑھ اِنعام

جموں وکشمیر اُردو فورم اِنعام/ اُدیان اکاڈمی، اُڑیسہ اعزاز/ لالہ جگت نارائن جالندھر اِنعام/ نمی ڈوگری سنستھا اِنعام

اُنتر راشٹریہ سمان اُپادھی سنستھان کی طرف ''ساہتیہ سُمن'' اعزاز

صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ڈراما ''بٹوارہ'' پر ۵۰،۰۰۰ روپے دیئے گئے۔

ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی، سہ ماہی ''رنگ'' دھنباد اور ''عصری آگہی'' دِلّی نے گوشے ـ کیے۔

''آب جو'' کشتواڑ کا ''آنند لہر نمبر''

جموں یونیورسٹی میں افسانوی مجموعہ ''انحراف'' اور ناولوں پر ایم فِل کی گئی ہے۔ اِس کے علاوہ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ میں ایک طالب علم ایم فِل کر رہا ہے۔

رابطہ : ۱۹ر بخشی نگر، جموں۔۱۸۰۰۰۱ (جموں وکشمیر)

فون : ۰۱۹۱-۲۵۸۲۶۵۱/۲۵۸۱۸۷۱

URDU BOOK SOCIETY
922, Rohella Street (1st Floor), Darya Ganj New Delhi-110002 India
Mobile : 9990422798